معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے　　فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ　یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:　حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا ــــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۴　ماہ جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۴ء　عدد ۵

مضامین

شذرات

دنیا کی تاریخ میں بارہا یہ ہوا ہے کہ قوت و اقتدار کے نشہ اور اکثریت کے گھمنڈ میں پروپگنڈے کے زور سے عیب کو ہنر، سیاہ کو سفید، جھوٹ کو سچ اور افسانہ کو حقیقت بنا دیا گیا ہے، جبر و قہر اور ظلم و تشدد پر آمادہ لوگوں نے اپنی دھاندلی اور عیاری سے اپنی جارحیت و زیادتی کو بھی حق و انصاف کا نام دیدیا ہے اور اپنی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی سے اپنے جرم و خطا کو صحیح و ثواب اور بے گناہ و بے خطا کو مجرم اور قصوروار ثابت کر دیا ہے، نصف صدی سے اس ملک میں یہی کہانی دہرائی جارہی ہے، اکثریت کے فرقہ پرست، شرپسند اور فتنہ پرداز لوگ ظلم و تشدد اور ناانصافی و زیادتی کے مرتکب ہونے کے باوجود اپنی چرب زبانی اور ملمع کاری سے معصوم، بے گناہ اور عدل و انصاف پسند بنے ہوئے ہیں اور جو لوگ ان کی جارحیت، شرپسندی، فتنہ انگیزی اور تشدد کا برابر نشانہ بنے ہوئے ہیں، وہ ان کے زور بیان اور کٹ حجتی سے تمامتر خطاکار اور گنہگار سمجھے جاتے ہیں، یہ امن و امان اور آئین و قانون کو درہم برہم کر کے بھی آئین پسند اور ہنرمند کہلاتے ہیں اور قانون کی بالادستی تسلیم کر کے ملک پر جان نچھاور کرنے والوں کو آئین شکن اور مجموعۂ عیوب قرار دیا جاتا ہے۔

اس کی مثالیں بہت ہیں، سب سے نمایاں اور تازہ مثال بابری مسجد کی ہے جس کو رام جنم بھومی قرار دینے کی کوشش نہایت شد و مد سے جاری ہے اور اس بالکل ہی بے سر پیر کی بات کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے نہ جانے کتنی مختلف و متضاد باتیں کہی جارہی ہیں کیونکہ ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے سینکڑوں من گھڑت اور جھوٹی باتیں کہنی پڑتی ہیں، لطف یہ ہے کہ فرقہ پسند اور جانبدار انتظامیہ اور فسطائی جماعتیں ہی یہ کارنامہ انجام نہیں دے رہی ہیں بلکہ نام نہاد سیکولر جماعتوں کے افراد بھی اپنا کرتب پوری مہارت سے

دکھا رہے ہیں اور انہی بازیگروں اور کرتب بازوں نے بالآخر مسجد کو مسمار کرا دیا جو اس تکنیک سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جس طرح جھوٹ کو مسلسل سچ کہتے رہنے سے آخرکار عام لوگ بھی اسے سچ باور کر لیتے ہیں، اسی طرح بابری مسجد کو بھی بار بار رام جنم بھومی کہنے سے ایک نہ ایک دن وہ واقعی رام جنم بھومی بن ہی جائے گی، ان کے زور زبردستی، عیاری اور کٹ حجتی کے سامنے ساری دلیلیں اور معقول باتیں ہوا ہو جائیں گی۔

عام لوگوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے لیکن اخلاق و قانون کو بالائے طاق رکھ کر بابری مسجد کو رام مندر بنانے کی کوششیں ایسے بھونڈے اور ڈرامائی انداز سے ہوئی ہیں کہ مسجد کے سارے واقعات ذہنوں میں محفوظ ہو گئے ہیں، انکو دہرانا بیکار ہے، اس وقت ہم سپریم کورٹ کے فیصلے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، اس کی جو تفصیل اخباروں میں شایع ہوئی ہے اس سے یہ صاف عیاں ہے کہ مسمار ہونے کے بعد بھی بابری مسجد کو خواب و خیال اور افسانہ بنا دینا آسان نہیں ہے، زور و زیادتی دھاندلی اور دغابازی اور فریب و مکاری سے اسے رام جنم بھومی بنانے کی راہ میں رکاوٹیں اور دشواریاں حائل ہو گئی ہیں، ڈھٹائی بے شرمی اور بے حیائی کی بات الگ ہے ورنہ مسجد و مندر کے نام پر شورش، ہنگامہ اور ہیجان برپا کر کے ملک کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کا منصوبہ خاک میں مل گیا ہے، اس کے مقابلہ میں کمزوروں، بے بسوں اور مظلوموں کو حوصلہ ملا ہے اور عدالت پر ان کا اعتماد بحال ہوا ہے، ۶ دسمبر ۹۲ء کو مسجد ڈھا کر درندہ صفت لوگوں نے وطن عزیز کو ساری دنیا میں ذلیل و رسوا کر دیا تھا، مگر ۲۴ اکتوبر ۹۴ء کے فیصلے نے انکی مجرمانہ غیر ذمہ دارانہ اور غیر آئینی حرکتوں کو بے نقاب کر کے ملک کا وقار بلند کیا ہے۔

عدالت عالیہ نے ابھی مسجد مندر نزاع کا فیصلہ نہیں کیا ہے اور وہ یہ کر بھی نہیں سکتی تھی اس سے تو صرف یہ رائے طلب کی گئی تھی کہ کیا مسجد کی جگہ پر پہلے کوئی مندر تھا، یہ جواب

دینا مورخین، محققین اور آثار قدیمہ کے ماہرین کا کام ہے اور وہ اس کا واضح اور مدلل جواب دیتے رہے ہیں جس کا علم ارباب حکومت کو اچھی طرح ہے مگر وہ حقائق سے آنکھ بند کرکے صرف مسئلے کو الجھانا اور سیاسی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں، حکومت کی بدنیتی کا اندازہ عدالت کو بھی ہوگیا تھا اگر وہ واقعی نیک نیت ہوتی تو سپریم کورٹ سے اصل نزاع کا تصفیہ کراتی مگر اس نے مسجد اور اس سے متصل آراضی کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مسجد کی جگہ پر ہی مندر بنانے کا تہیہ کیے ہوئے ہے، عدالت نے گو زمین اکوائر کرنے کو درست مانا ہے لیکن حکومت کو صرف رسیور کا درجہ دیا ہے جس کے بعد نہ رام للا ٹرسٹ کو مسجد کی جگہ پر مندر بنانے کا استحقاق ہے اور نہ وشو ہندو پریشد کو۔ سپریم کورٹ نے عدالت یا گفت وشنید کو حق ملکیت کے تصفیہ کی راہ بتا کر واضح کردیا ہے کہ عقیدہ و مذہب سے اجودھیا کے مسئلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن گفت وشنید کا تجربہ تو کئی بار ناکام ہو چکا ہے اس لیے اب عدالت کا بے لاگ فیصلہ ہی اس کا حل ہے، جس میں حکومت کے لیے مزید تاخیر و تعویق مناسب نہیں ہے۔

اس وقت کے وزیراعلیٰ اتر پردیش کو توہین عدالت کے جرم کی علامتی سزا اس کا ثبوت ہے کہ کوئی شخص عدالت و قانون سے بالاتر نہیں ہے، کسی ریاست کے وزیراعلیٰ کو توہین عدالت پر جیل اور جرمانہ کی سزا کا یہ پہلا واقعہ ہے، ملک کی بدقسمتی ہے کہ مجرم بھی ہیرو بن جاتے اور اتنے بڑے عہدوں پر فائز ہوجاتے ہیں، ان کو تو انتخاب ہی کے لیے نااہل قرار دیا جانا چاہیے تھا، ممکن ہے آئندہ اسکی بھی سزا پاجائیں، یہ تو جولائی ۹۲ء میں عدالت کے حکم امتناعی کے باوجود بابری مسجد کی ملحقہ زمین پر چبوترہ تعمیر کرانے کی سزا ہے، ان پر عدالت کو متواتر یقین دہانیوں کے باوجود ۶ دسمبر ۹۲ء کو مسجد گرا دینے کا جو مقدمہ قائم ہے، اس کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔

شذرات لکھے جاچکے تھے کہ راقم کے والد حاجی عبدالرحمٰن صاحب وفات پاگئے اِنَّا لِلّٰہ الخ ۱۱ نومبر کو جمعہ کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی، قارئین معارف سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

مقالات

مغربی افکار کی یورش اور علامہ شبلی کا کارنامہ

از مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری بھوپال

ہندوستان متعدد مذہبوں، ذاتوں، زبانوں اور رواجوں کا ملک تھا، غیراللہ کی پرستش کے جتنے نت نئے اور متنوع طریقے یہاں رائج تھے وہ کسی اور خطۂ زمین میں نہیں تھے۔ چودہ سو سال پہلے جب جزیرۂ عرب میں اسلام کا ظہور ہوا تو وہاں بھی غیراللہ کی پرستش کی جاتی تھی۔ اسلام نے عقائد صحیحہ کو پھیلا کر انسانوں کو اپنے خالق اور اپنی ذات کا عرفان بخشا۔

ہندوستان میں اسلام جزیرۂ عرب کی حدود سے نکل کر اسلام کا پیغام ساری دنیا میں پھیل گیا، خدا نے وعدہ فرمایا تھا کہ "لِیُظْہِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ کُلِّہٖ" اس کی تعمیل میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور عظیم خلفائے اسلام نے اس دین حق کو دلائل و براہین اور قوت و طاقت سے ظاہر و غالب کیا، اوائل عہد صحابہ ہی میں سرزمین ہند تک اسلام کا پیغام پہنچ چکا تھا اور بنو امیہ کے دور میں حجاج بن یوسف کی وساطت سے محمد بن قاسم نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں اس سرزمین پر خدا کی توحید کا کلمہ بلند کیا، اسی زمانہ میں افریقہ و ایشیا کی آخری حدود چین و مراکش تک بھی اسلام کا نور پہنچا

اور یورپ میں اسپین بھی اس دولت سے محروم نہ رہا۔

اُس وقت جدوجہاد اور اجتہاد کی روح کارفرما تھی اور صحیح اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر عمارت کھڑی ہو رہی تھی، نہ عجمی افکار و عقائد نے اسلام کے آب زلال کو گندلا کیا تھا اور نہ انکے زہر نے دینِ اسلام میں اپنی مہلک تعلیمات کے اجزاء ملا کر اس کے چشمہ شیریں و فرات کو کڑوا اور زہریلا بنایا تھا، اسلام قوت و اقتدار کے بجائے اپنی ذاتی اور داخلی اعلیٰ دینی، اخلاقی، اجتماعی اقتصادی اور انسانی تعلیمات کی بنا پر پھیلتا چلا گیا۔

ادبار و تنزل کا سایہ

پھر زمانہ نے کروٹ بدلی، ایک دن وہ تھا کہ اسلامی تعلیمات نے کفر و شرک و طاغوت کو ختم کیا تھا، اسلامی وحدت نے دلوں کو جوڑا تھا، اسلامی مساوات کے کامیاب تجربے نے اہلِ ہند کو تکریم انسانی اور مساوات بنی نوع آدم کا سبق پڑھایا تھا لیکن ادبار و تنزل کے سایے جب بڑھنے لگے تو توحید کے چشمۂ صافی میں شرک کی آمیزش ہوئی، غیر اللہ کی پرستش کے نت نئے طریقے ایجاد ہوئے۔

عبادت و استعانت میں فرق قرآن و سنت میں موجود نہیں تھا لیکن اس کو فلسفیانہ انداز سے واضح کیا گیا۔ خدا کو الوہیت و خالقیت کی صفات سے متصف کرنے کے باوجود استمداد و استعانت و ربوبیت یعنی کارخانۂ ہستی پر اقتدار و تسلط کی ساری صفات اس سے زبانی نہ سہی لیکن عملاً سلب کر لی گئیں اور دوسری زندہ یا مردہ شخصیتوں کو سونپ دی گئیں مساواتِ اسلامی کے بجائے تہذیب وطنی سے نسب و حسب پر فخر کی داستانیں شروع ہوئیں، روحِ جدوجہاد و اجتہاد میں کمی واقع ہوئی، تقلید محض کی بادشاہت عقائد و اعمال میں بڑھتی گئی، تکفیر و تفسیق کی گرم بازاری ہوئی اسلاف کے

جہاد کی حقیقت روپوش ہوگئی، حلم و کرم کے جذبات ختم ہوتے گئے اور کلی اسلام پر عمل پیرا ہونے سے گریز کیا گیا۔

مسلمانوں کی غفلت اور ان کے سامراجی مغربی دشمنوں کی چالاکی اور جنگی قوت سائنسی ترقی اور بے شمار اسباب کی بنا پر جزوی سامراجی تسلط شروع ہوا جو آخر کار انگریزوں کے مکمل اقتدار اور مسلمانوں کی صدیوں پر مشتمل حکمرانی کے زوال اور خاتمہ پر منتج ہوا۔ خدا کا رشتہ کسی قوم سے اس طرح پختہ نہیں ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے محبوب رہیں گے وہ محبوبیت کا حق ادا کریں یا نہ کریں کسی بھی باعزت قوم کو برباد کر دینا خدا کے قانون تکوینی میں ایک معمولی بات ہے "وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا"

امت کا ہر طبقہ ذمہ دار ہے

اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب بے شمار ہیں اور ہر فلسفی مورخ اور صاحب رائے اپنے انداز و تفکیر کے مطابق اس پر تبصرہ کرتا ہے، کوئی اس کا ذمہ دار صرف حکام کو گردانتا ہے کہ انہوں نے روحِ جہاد و عسکریت کو ختم کیا، کوئی عوام کو کہ ان میں بے دینی و بے عملی پھیل گئی تھی، کوئی علماء کو کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غافل تھے، کوئی بزرگانِ دین کو کہ انہوں نے پہاڑوں اور غاروں اور گھروں میں بیٹھ کر گوشۂ عافیت کو ترجیح دی اور اصلاحِ حال کا نبوی طریقہ جاری نہیں کیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک گروہ پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی بلکہ ہندوستان کی پوری امت اسلامیہ کی غفلت کا یہ نتیجہ تھا، آخری عہد میں بدعتوں کا رواج، روحِ اتحاد کا فقدان، مسائل فروع میں تکفیر و تفسیق کا رجحان ایسے تاریخی واقعات ہیں جن سے روگردانی نہیں کی جا سکتی، بدعتوں اور دین میں نت نئی اصطلاحوں

تعبیروں اور الفاظ کا ایسا انبار جمع ہوا کہ وہ سچے، مخلص اور پاکباز بندے جو واقعی بگڑوں کی اصلاح کے لیے اٹھے وہ خود کسی نہ کسی بدعت کا شکار ہو گئے یا کم از کم کتاب و سنت کی واضح اور روشن تعلیمات ہدایت کے بجائے اپنے ذاتی تجربات یا دوسروں کے تجربات کے داعی بن گئے اور عجیب و غریب قسم کے طلسماتی اسلام کے موید ہوئے۔ یہ تحریرات آج بھی شاہد ہیں کہ انکو سمجھنا مشکل ہے اور ان میں کتاب و سنت کی اصطلاحات کا فقدان پایا جاتا ہے۔

اسباب کی تلاش اور قانون قدرت کا نفاذ امتوں کے زوال، حکومتوں کے انحطاط اور محکومیت کے آغاز کے بعد اسباب کی تلاش مورخین کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے، لیکن قانون قدرت لاگو ہو تا رہا ہے، اسباب جو بھی ہوں لیکن واقعہ یہی ہے کہ صدیوں تک جو قوم حکومت و امامت کے منصب پر فائز تھی دفعتاً محکوم بن گئی اور مغربی سامراج اپنی فوجی قوت، سائنسی ایجادات، ترقی و تمدن اور زندہ امنگوں کے ساتھ ہندوستان کے افق پر چھا گیا۔

انگریزوں کے مقاصد یہاں اختصار کے ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کے مقاصد پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کو برٹش امپائر کا ایک اٹوٹ حصہ بنا دینا۔

۲۔ یہاں کے اقتصادی مورد سے استفادہ کرنا۔

۳۔ یہاں کے باشندوں میں مخالفت و منافرت کے جذبات پھیلانا تاکہ اس طرح اپنا اقتدار باقی رہے اور مضبوط ہو۔

۴۔ تہذیب و تمدن کے نام پر تعلیم میں تبدیلی اور قوم کو یہ احساس دلانا کہ تم

قرون وسطی کی ظلمتوں اور جہالتوں میں تھے اب انگریزی حکومت تہذیب و ترقی کی صبح امید بن کر طلوع ہوئی ہے اس لیے اس کا ساتھ دو اور یہ بھول جاؤ کہ وہ بدیسی حکومت ہے۔

۵۔ عام ہندوستانیوں سے نفرت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے خصوصی نفرت کیونکہ وہ سابق حکام تھے۔

۶۔ مسلمان حکام اور عہد سلطنت کے خلاف انتہائی چالاکی سے پروپگنڈہ کرنا کہ وہ غیر مہذب، متعصب، خونخوار اور ظالم تھے۔

۷۔ اسلام چونکہ حکومت کھو چکا تھا لیکن اس میں اپنی ذاتی اور داخلی قوت تھی، اس لیے اس کی تعلیمات کے خلاف زبردست محاذ قائم کرنا اور منظم طریقے سے اس کو ہندوستان میں پھیلانا۔

۸۔ ہندوستان کو ایک مسیحی ملک بنانا اور مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ وسیع پیمانے پر کھولنا۔

۹۔ مسلمانوں میں مذہب سے بغاوت کی روح پھیلانا اور یورپ کے تہذیبی محاسن کو اس انداز سے واضح کرنا کہ وہ اپنے مذہب سے دور ہو جائیں تاکہ اس طرح وہ ذکر الٰہی سے غفلت کی بنا پر کسی بھی مغربی شیطان سے متاثر ہو جائیں۔

سامراج کو ملک سے نکالنے کی کوشش سامراجی تسلط کے بعد سامراج دشمنی کا مظاہرہ ملک کے بہت سے علماء و مفکرین اور سیاست دانوں نے کیا، ایک عظیم کوشش یہ تھی کہ برطانوی راج کو ختم کیا جائے، انگریز واپس جائیں اور ہندوستان آزاد و خود مختار ملک بنے، اس سیاسی کوشش میں بھی مختلف النوع نظریات سامنے

آئے اور تمام ابنائے وطن اس میں شریک ہوئے اور تقریباً ایک صدی کی کوششوں کے بعد برطانوی سامراج ہندوستان سے واپس گیا اور اس کے نتیجہ میں دو ملک وجود میں آئے اور ۱۹۴۷ء میں ہندوستان و پاکستان کو تاج برطانیہ سے آزادی و خودمختاری ملی۔

فکری بالادستی کے خلاف احتجاج ان سیاسی کوششوں کے علاوہ دوسری کوششیں وہ تھیں جن کا تعلق سامراج کی علمی و تمدنی و فکری بالادستیوں کے خلاف قوم کو بیدار کرنا تھا، جسم کی غلامی ہمیشہ فکر و ذہن کی غلامی سے کم نقصان دہ ہوتی ہے جسم آزاد بھی ہو جاتا ہے لیکن فکر غلام رہتی ہے اور اس کا مشاہدہ تمام ان ملکوں میں بآسانی کیا جا سکتا ہے جہاں سے برطانوی و یورپی سامراج واپس جا چکا ہے لیکن فکری غلامی نہ صرف یہ کہ اب تک باقی ہے بلکہ روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہے۔

جو علماء ان فکری و دینی و علمی کوششوں میں شریک ہوئے، ان کی تعداد کا تعین ناممکن ہے، بے شمار علماء نے ان کوششوں میں حصہ لیا، اس وقت امت کی اصلاح اور انگریزی افکار سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو مختلف النوع کوششیں ہوئیں انکو تین طرح کے نظریات کے ماتحت لکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ **علاج بالضد** انگریزوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے، انکی گفتار، رفتار اور کردار کی مخالفت کی جائے، فارسی زبان بحیثیت سرکاری زبان ختم ہو جانے کے بعد اب انگریزی زبان نہ سیکھی جائے اور نہ وہ جدید علوم جو انگریزوں کے ساتھ آئے ہیں ان پر کوئی توجہ دی جائے اور فارسی و عربی اور دینی و اسلامی علوم کی حفاظت پر پورا زور دیا جائے۔

اس نظریہ کا مثبت پہلو یہ تھا کہ اس طرح انگریزی سامراج کو شکست دی جا سکتی تھی اس کی زبان، تہذیب اور تمدن کی اثر انگیزی کم سے کم ہو سکتی تھی، اپنی قدیم میراث اور تہذیب و علوم کی حفاظت ہو سکتی تھی۔

لیکن منفی پہلو یہ تھا کہ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی آباد نہیں تھے کہ انکا یہ جزوی احتجاج پوری طرح کامیاب ہو سکتا، مصر میں جب عربی کی جگہ انگریزی سرکاری زبان بنائی جانے لگی تو تمام اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں چھ ماہ تک اسٹرائک رہی، وہاں ایک ہی زبان پورے ملک میں جاری و ساری تھی اور اس کی بقا کے لیے مصری قوم پوری طرح متحد تھی اس لیے انگریزوں کی یہ کوشش ناکام ہوئی اور عربی زبان باقی رہی، لیکن ہندوستان چونکہ مختلف زبانوں، تہذیبی اکائیوں اور مذہبوں کا ملک تھا اس لیے یہاں یہ جزوی احتجاج کارگر نہ ہو سکا اور چشم زدن میں انگریزی زبان سرکاری زبان بن گئی اور ہندوستان کی دوسری قوموں نے اس کی پذیرائی کی کیونکہ فارسی زبان بھی اس خطۂ زمین کی زبان نہیں تھی بلکہ وہ بھی ایک غیر ملکی زبان تھی۔

دوسرا منفی پہلو یہ تھا کہ خود دین کی خدمت، دفاع اور حفاظت کا پہلو اس طرح نئے حالات میں مکمل طور پر پورا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ انگریزوں کی مشنریوں اور انگریزی مولفین کے اسلام پر اعتراضات وغیرہ کے جواب دینے کے لیے وہ زبان اور وہ علوم ضروری تھے جن کے ذریعہ کامیاب مدافعت ممکن ہو۔ کامیاب اور فوری ترجمے بھی کسی حد تک بدل ہو سکتے ہیں، لیکن خود ترجمے کے لیے دونوں زبانیں اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔ دشمن کے پاس اگر ٹینک اور ہوائی جہاز ہوں تو مدافعت کے لیے صرف تیر و تفنگ نہ کارگر ہیں اور نہ ہوشمندی کی علامت ہیں۔

۲۔ علاج بالمثل دوسرا نظریہ یہ تھا کہ دنیاوی ترقی اور تمدن کے حصول کے لیے حکام کی مکمل تقلید کی جائے اور زندگی، معاشرت، تمدن، رہن سہن، وضع قطع و لباس اور تعلیم وغیرہ سب میں انگریزوں کی اتباع کی جائے تاکہ لوگوں میں حاکم قوم سے مرعوبیت کی فضا ختم ہو یعنی اعتقاد و عبادات کو چھوڑ کر مکمل طور سے قوم انگریز بن جائے۔

اس نظریہ کا ایجابی پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں بسنے والی دوسری قومیں انگریزی زبان اور تعلیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں اور اس طرح آگے چل کر وہ ملک کے تمام کلیدی مناصب، نوکریوں، درسگاہوں، شفاخانوں، زندگی کے تمام مرحلوں اور سیاسی مورچوں پر قابض ہو جائیں گی اور مسلمان سیاسی و اجتماعی واقتصادی میدانوں میں بالکل پیچھے رہ جائیں گے۔

لیکن اس کا منفی پہلو یہ تھا کہ شروع سے آنکھ کھولنے کے بعد جب بچہ انگریزی ثقافت و تمدن سے آشنا ہوگا اور گھر، اسکول اور شاہراہ پر اور اخبار، رسالوں، کتابوں اور مدرسوں میں جب اسے اسلام کے صحیح عقائد و اعمال کا کہیں نشان نہیں ملے گا تو تعلیم یافتہ ہونے کے بعد وہ انگریز بن جائے گا اور صرف اقتصادی و اجتماعی و سیاسی میدانوں ہی میں نہیں بلکہ عقائد و عبادات میں بھی شک و تذبذب کا شکار ہو کر الحاد کے فریب میں مبتلا ہو جائے گا، انگریزوں کی قومی، علمی، فکری، تمدنی اور ہمہ گیر برتری کی داستانیں جب وہ نصاب تعلیم میں اور ہر جگہ پڑھے اور سنے اور دیکھے گا اور مسلمانوں کی عالمگیر تباہی، جہالت، ظلم و ناانصافی اور بربریت کے قصے جب وہ سنے گا اور مسلمانوں کی درماں اور اسلام کی روشن تاریخ و تہذیب سے وہ ناواقف ہوگا تو اس میں نادانستہ طور پر مخالفانہ جذبات ابھریں گے اس پر مستزاد یہ کہ جس زبان کو

وہ سیکھے گا اس میں انتہائی منظم طریقے پر اسلام کے بنیادی عقائد، پیغمبر اسلامؐ کی عظیم شخصیت اور خلفائے اسلام کی مثالی زندگی پر بہتان و افترا کا ایک انبار اسے ملے گا ان سب چیزوں کا عکس اور منفی اثر ملت اسلامیہ کے پڑھے لکھے طبقہ پر انتہائی برا اور مہلک ہوگا۔

مرکب علاج مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ تیسرا نظریہ تھا کہ اصل مقصد مریض کی اصلاح اور بیماری کی شفا ہے، کسی ایک علاج یا دوا پر اصرار کسی حاذق طبیب کا شیوہ نہیں ہے، وقت، حالات، موسم، مزاج اور بیماری کے خطرات کو دیکھتے ہوئے مرکب علاج بھی ممکن ہے اور ہر علاج کے طریقے میں سے مضر پہلوؤں کو ہٹا کر مفید پہلو اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

اس لیے ہندوستان کے نئے حالات سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں، برطانوی سامراج کا اقتدار گو شرعی و قانونی طور سے کالعدم ہے کہ کسی دوسرے کے ملک پر یا گھر پر بغیر اس کی مرضی کے زبردستی قبضہ کر لینے سے قانونی حق حاصل نہیں ہوتا لیکن واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ کا غاصبانہ قبضہ و تسلط یہاں قائم ہو چکا ہے، آخری امید کا سہارا یعنی ۱۸۵۷ء کا انقلاب بری طرح ناکام ہو چکا ہے، اس میں شریک ہونے والوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں، سرکاری زبان فارسی کی جہانگیری ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ پر انگریزی زبان سرکاری زبان تسلیم کی جا چکی ہے، سائنسی ترقی نے محیر العقول ایجادوں کا دروازہ کھول دیا ہے، انسانی ترقی اور راحت رسانی کے سامانوں کے علاوہ سائنس نے نئے جنگی ہتھیار بھی پیدا کیے ہیں اس لیے انگریزی زبان اور نئے علوم کا سیکھنا۔ چند شرطوں اور قومی و دینی نگرانی

کے ساتھ۔ ازبس ضروری ہوگیا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اپنے مسلمہ عقائد و عبادات سے پوری طرح واقف ہونا بھی ضروری ہے، عربی و فارسی زبان اور اسلامی تعلیمات سے دوری انتہائی مہلک نتائج پیدا کرسکتی ہے، ساتھ ہی اسلامی تاریخ و تمدن و ثقافت و علوم کی روشنی سے واقف ہونا بھی لابدی ہے تاکہ یورپ سے فکری مرعوبیت کی بیماری میں قوم مبتلا نہ ہو، نیز اسلام دشمن پروپگنڈہ کے اثر سے قوم کو بچانا وقت کا سب سے اہم فریضہ ہے۔

اسلامی اصول سے یہ نظریہ صحیح ہے

یہ نظریہ معقول و معتدل ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل مثبت و ایجابی پہلوؤں کا حامل ہے اور کتاب و سنت کے نصوص اور اسلامی اصولوں پر پورا اترتا ہے اور اسلامی تاریخ سے اس کے شواہد و نظائر مل سکتے ہیں، قرآن و سنت نے علم کے دروازے کبھی بند نہیں کیے، فکر و نظر اور تدبر و تعقل کی جگہ دعوت دی، ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں ارسال کرنے کی حکمت یہ تھی کہ جہاں بھی اسلام کا عالمی پیغام پہنچایا جائے وہاں کی زبان داعی کو سیکھنی چاہیے، حکمت مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے جہاں بھی ملے اس کو حاصل کرے وغیرہ، علماء و حکمائے اسلام نے ہر دور کی ضروریات اور ہر زمانہ کے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور اس سے اسلام کی مدافعت و حفاظت اور تبلیغ کا کام لیا ہے۔

یہ تیسرا نظریہ جن علماء و مفکرین کا تھا ان کے گوہر شب چراغ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

اسلام کے چشمہ صافی میں زہر کی آمیزش

برطانوی سامراج کے زیر اثر آزادی صحافت و حریت رائے کی آڑ لے کر مغربی ریسرچ اسکالروں اور تبشیری اداروں

نے اسلام کے چشمۂ صافی میں زہر ملانے کی کوششیں کیں، اسلام کے عقائد، عبادات، اجتماعی، اقتصادی اور انسانی قواعد و قوانین کو چیلنج کیا، ان پر ظلم و نا انصافی کا الزام لگایا، اسے جنگلی اور صحرائی عربوں کا نظام حیات ثابت کیا جو ترقی یافتہ زمانہ اور قوموں کے لیے موزوں نہیں ہے، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو ظالم بدہن گستاخ خونخوار منتقم اور سفاک و جابر ثابت کیا جنھوں نے اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا اور عظیم خلفائے اسلام کی ہر خوبی کو خرابی بنایا اور ہندوستان میں ان افکار کو بڑے پیمانہ پر پھیلایا۔

ان حالات میں ضرورت تھی کہ عالم اسلام سے کوئی عظیم عالم و مفکر، فلسفی و مورخ انسان اٹھے جو ان باطل دعووں کی تردید کرے اور علمی و استدلالی انداز میں مستشرقین یورپ کے حملوں کا جواب دے اور ان کی علمی غلطیاں دنیا کے سامنے واضح کرے۔

شب دیجور سے صبح پرنور

۱۸۵۷ء کے پرآشوب سال کی جو تصویر مورخین کے قلم نے کھینچی ہے اسے دیکھ کر بجا طور پر ان دنوں کو "ایام نحس مستمر" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جس طرح شب دیجور سے صبح پرنور کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح خدا کی قدرت سے ۱۸۵۷ء کے مطلع سیاہ سے شبلیؒ کا آفتاب نور طلوع ہوا جس نے اسلامی افکار، تاریخ، تمدن اور عظیم شخصیتوں پر دشمنوں کے ڈالے ہوئے غبار کو اس طرح صاف کیا کہ وہ آئینۂ شفاف بن کر عظمت کا نشان بن گئیں۔

مولانا شبلیؒ کی عظمت کے مختلف پہلو ہیں ہم یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف انگریزوں اور مستشرقین کی اسلام دشمنی کے سلسلے میں ان کی علمی کاوشوں کو نمایاں کریں گے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے عیسائی مشنریوں کے حملوں کا تذکرہ کیا ہے اور بعض علماء ومفکرین کی کوششوں کو تائید غیبی ثابت کیا ہے، پھر ان حضرات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے سائنس کے اکتشافات کی روشنی میں جواب دیے ہیں لیکن باقاعدہ عالم نہ ہونے کی وجہ سے وہ دورانہ کار تاویلات کا شکار ہوگئے ہیں، پھر مغرب کے ریسرچ اسکالروں کا طریقہ واضح کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ پڑھ کر علم و ریسرچ کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کو اعتراض کرتے ہیں "ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلے کے لیے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلیؒ تھے جنھوں نے ان ہی کے طریقہ سے، ان ہی کے اسلوب پر انکو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی" (حیات شبلی: مقدمہ ۲۵)

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم اس سلسلہ میں مولانا شبلیؒ کی سب سے پہلی تصنیف "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" تھی، یہ دراصل ایک مقالہ تھا جو ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ (محمڈن تعلیمی مجلس) کے لیے لکھا گیا تھا اور ۲۷ دسمبر ۱۸۷۸ء کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا، اس خطبہ کی دھوم سارے ملک میں مچ گئی، اسلام دشمن مغربی دانشوروں نے مسلمانوں کی جہالت اور علم دشمنی کے جھوٹے افسانے جس طرح پڑھے لکھے لوگوں میں پھیلا رکھے تھے اس مضمون میں انکا علمی و تاریخی جواب تھا اور مسلمانوں کے لازوال علمی کارناموں کو نمایاں کیا گیا تھا اور ان کے مکاتب و مدارس اور علمی مشغلوں کی تحقیقی دستاویز تھی، مسلمانوں کے کانوں میں پہلی بار اپنے عظیم اسلاف کے عظیم الشان علمی

کاموں کی آواز آئی، یہ خطبہ مولانا کی شہرت کا پہلا زینہ بنا۔

گذشتہ دینی تعلیم کو غور سے پڑھنے والا یہ جان سکتا ہے کہ مولانا کے دل میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی وغیرہ کے جو منصوبے تھے اس کا تخم اول اس کتاب میں موجود ہے، اس خطبہ نے دینی مدارس میں اصلاح کا عام خیال پیدا کیا۔

مسلمانوں کی علمی ترقی اور المامون مسلمانوں کی علم دوستی و علم پروری ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے، لیکن علم و ریسرچ کے نام پر ان کے اسلاف کی سیرتوں کو بگاڑ کر پیش کرنا مستشرقین اور یورپ کے دانشوروں کا شعار رہا ہے، مسٹر پامر نے ہارون الرشید پر کتاب لکھکر اس عظیم خلیفہ کا حلیہ بگاڑنے کی پوری کوشش کی تھی، مولانا شبلیؒ نے جب ناموران اسلام لکھنے کا ارادہ کیا تو تاریخ بنی عباس کی سب سے اہم علمی شخصیت المامون پر قلم اٹھایا، اس کتاب میں علمی و تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ گویا مسٹر پامر کے زہر کا تریاق بخشنا بھی مولانا کے خیال میں تھا۔

یہ کتاب بھی مغربی مورخین کے اعتراضات اور مفروضات کے ابطال میں معین ثابت ہوئی اور مسلم فرمانرواؤں کی علم دوستی کا بین ثبوت فراہم ہوا، یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی اور تین ماہ کے اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔

سفرنامۂ مصر و روم و شام یہ بظاہر ایک مسافر کا سفرنامہ ہے لیکن جابجا مسافر نے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے پیوست کر دیے ہیں، اسلامی حمیت و غیرت، اسلامی حکومت اور سرزمین اسلام سے محبت و تعلق، مسلمانوں کی محکومی پر غم و الم، اسلامی ممالک پر سامراجی کوششوں کی تصویر، وہاں کے علمی و سیاسی و اجتماعی احوال پر کہیں مسرت اور کہیں ماتم، تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں اپنی آرا کا نچوڑ، خصوصاً عالم عربی و ترکی نیں

کتب خانوں سے استفادہ اور نادر مخطوطات سے کام کی چیزوں کی نقول حاصل کرنا، اس کی تفصیل سفر نامہ میں ملتی ہیں، پھر مدرسوں کی زیارت اور نظام تعلیم و نصاب درس پر تبصرہ بھی ہے جس میں وہی رونا ہے کہ:

"عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ ڈانڈے نہیں ملیں گے ترقی نہ ہو سکے گی"[1]

جدید کالجوں میں ملٹری کالج، لا کالج، ٹکنیکل کالج، ایگریکلچر کالج، سول سروس کالج وغیرہ کا انہوں نے قسطنطنیہ میں مشاہدہ کیا اور قابل ذکر باتوں کو لکھا تاکہ ان کو ہندوستان میں رائج کیا جائے، کالج میں ہر طالب علم کے لیے ایک لباس انہیں بہت پسند آیا، اس سے مساوات کا درس ملتا ہے اور غریب طلبہ میں احساس کمتری پیدا نہیں ہوتا، آگے لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ترکی نہایت فخر سے اس بات کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس نے بورڈنگ کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں نہایت کثرت سے طلباء رہتے ہیں۔ لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک، لباس، وضع، مکان، فرنیچر تمام چیزیں ایک سی ہوں اور طالب علموں کی حالتوں میں فرق مراتب کا شائبہ نہ ہو، ..... اسکا اثر یہ ہے کہ کالج کے احاطہ میں جا کر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے۔" (سفرنامہ مصر و روم و شام ص ۵۰-۵۱)

---

[1] مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۴، قسطنطنیہ سے ۱۵ جون ۱۸۹۲ء کا لکھا ہوا خط بنام سرسیدؒ۔

مطبوعہ علی گڑھ، جولائی ۱۸۹۴ء)

انگریزوں نے مساوات انسانی وغیرہ کے نام نہاد دعووں سے دنیا کے ناواقفوں کو مرعوب و مسحور کر رکھا ہے لیکن فرق مراتب کا چلن جس طرح ان کے دور اور ان کی ریاستوں میں ہوا کہیں نہیں ہوا، حاکم و محکوم میں فرق، بڑے افسر اور چھوٹے افسر میں فرق، طلبہ میں فرق، گورے اور کالے میں فرق، رہن سہن اور رہائش گاہوں میں فرق، سفر کے طریقوں میں فرق وغیرہ، مولانا شبلیؒ کے قلم نے اشارہ کی زبان سے اس کا پردہ چاک کیا ہے اور ترکوں کو اس باب میں یورپ کے لوگوں سے فوقیت دی ہے، لکھتے ہیں:

"یورپ کے بڑے بڑے کالجوں میں یہ بڑی کمی ہے کہ کم مقدور لوگوں کو انکی فیاضی سے چنداں فائدہ نہیں پہنچتا، ترکوں نے اسی نقصان کا تدارک کیا ہے اور نہایت خوبی سے کیا ہے۔" (سفرنامہ ۵۱)

یہ اسلامی و انسانی مساوات دیکھ کر ان کو یقیناً علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کی حالت زار بھی یاد آئی۔

"بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا اور میں اسکے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا"... میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے اور نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر کلیتہً ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج کل قائم ہیں بالکل مٹا دی جائیں" (سفرنامہ ص ۵۱-۵۲)

یہی بات وضاحت کے ساتھ انہوں نے اپنے والد شیخ حبیب اللہ کے خط میں قسطنطنیہ سے ۵ر جون ۱۸۹۲ء کو کہی :

" ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا، سید صاحب قبلہ (سر سیدؒ) بغیر کسی پس وپیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے "

(مکاتیب شبلیؒ ج ۱، ص ۱۲)

الغرض مغربی تہذیب کے زیر سایہ جو مصائب آئے تھے ان ہی سے یہ فرقِ مراتب بھی تھا، مولانا شبلیؒ کو اس سے سخت نفرت تھی اور اسلامی مساوات کے اصولوں کا بڑا پاس تھا، علی گڑھ اور پھر جب مولانا ندوہ تشریف لائے تو وہاں بھی ان اصولوں کی پابندی اور مظاہر کا انہیں بڑا خیال تھا اور طلبہ کو اپنی ذہنی آسودگی، بلند فکری، عالی ظرفی اور اپنی علمی ودینی قیمت پہچاننے پہ وہ بڑا زور دیتے تھے۔ آج بڑے بڑے دینی مدرسوں میں لوگ لباس خواب میں سڑکوں پر چلتے نظر آتے ہیں، امیر طلبہ کے ساتھ خصوصی برتاؤ ہوتا ہے بلکہ ایسے مالدار علاقوں جہاں سے چندے یا ہدایا وصول ہوتے ہوں ان کو خصوصی رعایتیں دی جاتی ہیں۔

اس سفر میں انہیں حاکم اور محکوم ملکوں میں جو تفاوت ہے اور غلام اور آزاد قوموں کی ذہنیتوں میں جو فرق ہے وہ محسوس ہوا، مولانا نے مصر میں ازہر کی زبوں حالی پر بھی نوحہ کیا ہے۔ لیکن جامعہ ازہر میں جو اصلاحی کوششیں بعد میں ہوئیں انکی وجہ سے وہ اب دنیائے اسلام میں اسلام کا سب سے بڑا قلعہ ہے۔ مولانا نے مصر کے کتبخانے آثار قدیمہ، اہرام وغیرہ بھی دیکھے۔

الغرض مولانا کا یہ سفرنامہ ان کے اصلاحی نظریۂ تعلیم وتربیت کا آئینہ دار

بھی ہے اور مغربی طاقتوں کے مقابلہ کے لیے وہ جس قسم کی علمی وعملی صلاحیتوں سے مزین قوم دیکھنا چاہتے تھے اس کا اظہار بھی ہے

خلیفہ عثمانی کی طرف سے اس سفر میں انہیں تمغۂ مجیدی ملنے کی وجہ سے برٹش حکومت اندر ہی اندر چراغ پا تھی، بہرحال جب یہ طے ہوگیا کہ اس سفرنامہ میں شہد ہی شہد رہے گا کوئی زہریلی چیز نہ ہوگی تو اس کے لکھنے کی اجازت ملی، یہ سفرنامہ خالص علمی اور معاشرتی پہلوؤں تک محدود رہا پھر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس سفرنامہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ترکی کی محبت کا بیج نہیں بویا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی

"اسی لیے انگریزوں نے مولانا کے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا "

مولانا کے رسائل ومقالات بے شمار ہیں، موضوع سے متعلق تمام مضامین پہ تبصرہ یا انکا تذکرہ بھی اس مختصر مضمون میں مشکل ہے تاہم چند اہم تحقیقات کی نشاندہی ضروری ہے۔

الجزیہ مولانا کا اہم مضمون ہے، اس کی تفصیل اس لیے بیان نہیں کرتا کہ اس کی شہرت عام ہے، مولانا نے فقہا وتاریخ وسیر سے یہ ثابت کیا کہ جزیہ نصرت وقتال کا معاوضہ ہے، اگرچہ بعض فقہا نے اس کو قتل کا بدل اور بعض نے دارالاسلام میں سکونت کا بدل بھی لکھا ہے، مولانا نے اس الزام کا پردہ چاک کیا کہ غیر مسلم جزیہ کی حقیر رقم کے بدلے اپنا ایمان فروخت نہیں کر سکتے۔ راقم یہاں مزید یہ کہنا ضروری سمجھتا ہے کہ جزیہ میں دی ہوئی قلیل رقم کی جگہ پر ایک مسلمان اپنی دولت کا چالیسواں حصہ ہر سال زکوٰۃ میں ادا کرتا ہے، پس اگر اقتصادی اور مالی مسائل کی بنا پر کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے تو سارے مالدار مسلمان زکوٰۃ کی عدم ادائیگی

کی غرض سے کسی دوسرے مذہب میں شامل کیوں نہیں ہوئے؟

اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا انگریزی و عربی میں ترجمہ ہوا اور سرسید مرحوم نے اس کی تعریف میں یہ الفاظ لکھے کہ اگر شبلی نعوذ باللہ "اپنے رسالے الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ تو کچھ تعجب نہ ہوگا" (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میگزین ۱۰ مارچ ۱۸۹۳ء) (حیات شبلی: ص ۲۳۴)

حقوق الذمیین

یورپین متعصب مستشرقین نے صلیبی جنگوں سے پہلے ہی یہ غلط الزام لگایا تھا کہ مسلم ممالک میں غیر مسلم رعایا پر ظلم وستم ہوتا ہے اور ان کو کسی قسم کے شہری حقوق حاصل نہیں ہیں، پھر جب ترکی مقبوضات میں سے صوبہ ارمینیا میں مسلح بغاوت ہوئی اور ترکی حکومت نے اس کو بزور فرو کیا تو مسیحی دنیا چیخ اٹھی اور متعدد زہریلے مضامین لکھے گئے جن میں مسلمانوں کے تعصب اور مسیحیوں پر ظلم وستم اور زیادتی کے افسانے لکھے گئے تھے، اس موقع پر مولانا شبلی نے "حقوق الذمیین" لکھ کر ان اعتراضات کی دھجیاں بکھیر دیں، کتاب وسنت کی نصوص، فقہ اسلامی کے حوالوں اور تاریخ کے صحیح اور مسلم الثبوت واقعات سے اس الزام کی تردید کی اور الزامی طور پر یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کے کسی مذہب یا قوم نے ایسے حقوق آج تک عطا نہیں کیے جو اسلام نے عطا کیے وہ عدل وانصاف پر مبنی تھے، بلکہ اسکی بلندی تک یورپ کی سلطنتوں کے قول کا پرپرواز ہنوز نہیں پہنچا ہے۔

اسی موضوع سے متعلق غیر فرمانروایانِ اسلام پر تعصب کے الزام کی تردید میں وہ اہم مضمون ہے جو مولانا نے اورنگزیب عالمگیر پر لکھا تھا۔

کتب خانۂ اسکندریہ

مسلمانوں کی علم دشمنی کے من گھڑت قصوں میں سے فتوحات اسلامیہ کے دوران کتب خانۂ اسکندریہ کو جلا دینے کا واقعہ بھی تھا جس کو خوب شہرت دی گئی تھی، یہ کتب خانہ صدیوں کی محنتوں کا خزانہ تھا، مولانا نے علمی وتاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ یہ الزام سراسر غلط ہے بلکہ خود مسیحیوں نے اپنے زمانہ میں صدیوں پہلے اسے برباد کر دیا تھا، خود یورپین مورخین نے اسکا اعتراف کیا ہے۔

تمدن اسلامی پر تنقید

مصر کے مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان نے قبۃ الاسلام قاہرہ میں بیٹھ کر تمدن اسلامی پر جو کتاب لکھی اس میں بظاہر تعریفی انداز ہے لیکن خلفائے اسلام کے مثالب ومعائب کو اس میں شاطرانہ انداز سے جمع کر دیا گیا ہے، نادان مسلمان اس کے شکر گذار تھے اور دانا دشمنوں نے اس کی قدر کی، پروفیسر مارگولیتھ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں چھپوایا، عالم اسلامی میں سے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کی سعادت مولانا شبلیؒ کے حصے میں آئی، علامہ رشید رضا نے "الانتقاد" کو تعریف وتقریظ کے ساتھ مجلہ المنار میں چھاپا، علمائے مصر وعالم عربی نے اسکی پوری قدر کی اور مولانا کی جلالت مرتبت کا اعتراف کیا۔

الفاروق، اسلامی کارناموں کی دستاویز

مولانا شبلیؒ نے اپنی اہم اور شہرۂ آفاق کتاب الفاروق لکھی تو بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ایک خلیفۂ اسلام کی سیرت وسوانح ہے اور ممکن ہے اس سے سنی اور شیعہ تنازعہ بڑھے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس طرح آج اسلامی فلمیں بنانے پر اعتراضات ہیں اس سے کہیں بڑھ کر اس وقت الفاروق لکھنے پر اعتراضات تھے، ہر طرف سے یہ صدا آرہی تھی کہ الفاروق کی تالیف نہ ہو حتیٰ کہ سرسید جیسے روشن خیال نے بھی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۹۳ء میں

ایک مضمون لکھا جس میں مولانا شبلیؒ کے علمی کاموں کی فراخدلی کے ساتھ پوری قدردانی کی اور تعریف کے بعد آخر میں لکھتے ہیں "مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے پر کہ بزرگانِ دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کر کے ان کی لائف لکھیں ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ اس سے متفق ہیں، وہ لوگ فادرز آف اسلام ہیں نہ ہیروز آف اسلام اور ہم دعا کرتے ہیں کہ مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں"۔

لیکن آخرکار مولانا نے الفاروق لکھی اور اس طرح اسلام کے تمدنی و قانونی امور کی ایک ایسی دستاویز تیار ہو گئی جو یورپ و امریکہ کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے، دنیا کے بڑے سے بڑے مدبر اور فرمانرواؤں کے کارنامے فاروقی کارناموں کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔

ایک بات ضروری یہ ہے کہ فادر آف اسلام خالص مسیحی پادریوں کی اصطلاح ہے، اسلام کا کوئی فادر نہیں ہے، خدائے پاک اسلام کو نازل کرنے والا ہے اور رسول پاکؐ اسوہ و نمونہ ہیں اور صحابہ کرامؓ و خلفائے عظام اس کی صحیح اور عملی تطبیق کرنے والے ہیں۔

الفاروق کا مقصد بھی اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور اسلام دشمن مخالفین کی دسیسہ ریزیوں کا جواب تھا۔

سیرۃ النبیؐ مغربی مورخین نے اسلام پر اعتراضات کے زمرہ میں ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو رکیک اور غیر مستند الزام لگائے ہیں اور مستشرقین یورپ کی ایک جماعت نے تعریفی انداز اختیار کر کے جن مسموم نظریات کا بیج بو دیا ہے، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مولانا شبلیؒ نے سب سے آخر میں سیرۃ النبی لکھ کر ان تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے، یہ اپنے طرز کی عظیم سیرت ہے اس کی خوبیوں اور کمالات کے لیے

پورا ایک مفصل مضمون درکار ہے، الفاروق اور سیرۃ النبی نے کتنے گروہوں کو تھام لیا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے سیرت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اسلامی عقائد و عبادات و معاشرت کے جملہ موضوعات پر بحث کا منصوبہ بنایا تھا جو ان اسلامی تعلیمات پر مشتمل تھیں جن کو لے کر آپؐ مبعوث کیے گئے تھے، جس کو باحسن وجوہ ان کے شاگرد رشید اور استاذ الاساتذہ سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے پورا کیا۔

مولانا نے اپنے اشعار، مثنویوں اور بے شمار مقالات میں مغربی طلسم کو توڑا ہے، اسلام کے محاسن بیان کیے ہیں، ترکوں سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ ترکوں کی فتوحات خوشی اور مسرت کے ترانے گائے ہیں، واقعہ مسجد کانپور پر ان کی نظمیں اور شہر آشوب اسلام وغیرہ ہمارے اس دعوے پر شاہد ہیں، لیکن ہم طوالت کے خوف سے یہاں ان چیزوں کا تذکرہ نہیں کرتے۔

شبلی کا اثر عصر حاضر پر آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا شبلیؒ نے علمی و تاریخی و مذہبی نثر نگاری کا جو نیا اسلوب اردو میں ایجاد کیا اس کا علمی و ادبی اثر برصغیر ہند و پاک کے تمام لکھنے والوں نے قبول کیا اور اب جو شخص بھی اچھی علمی زبان لکھتا ہے وہ ان کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، مولانا شبلیؒ کی اصلاح تعلیم کی تحریک بھی کامیاب ہوئی اور مغربی پروپگنڈہ کا اثر بھی زائل ہوا۔

ابنائے شبلیؒ علامہ شبلیؒ اولاد کے بارے میں زیادہ خوش قسمت نہ تھے اور ان میں سے کسی نے کوئی قابل ذکر دینی یا علمی خدمت نہیں کی لیکن جس شخص کی معنوی اولاد اور شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد جیسی شہرۂ آفاق ہستیاں ہوں اس سے

زیادہ خوش نصیب کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

مولانا کا مقصد یہ تھا کہ اپنے بعد بھی علماء کا ایک ایسا تربیت یافتہ گروہ چھوڑ جائیں جو وقت کی ضرورتوں پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ قلم اٹھائے، ندوۃ العلماء کی پوری جماعت اور دارالمصنفین سے منسلک تمام حضرات مولانا کی فکری و ادبی تاثیر کی وجہ سے براہ راست ابنائے شبلی میں شمار کیے جاتے ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی بھی شاگردوں ہی کی طرح مولانا شبلی کی صحبت سے مستفید ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال ندوی حلقہ سے باہر کی دو اہم شخصیتیں اور ہیں جنھوں نے مغربی تہذیب کے خلاف جو کام مولانا نے شروع کیا تھا اس کو آگے بڑھایا اور وہ مولانا کے دائرہ اثر میں شمار کی جاتی ہیں، ایک شاعر مشرق علامہ اقبال جنھوں نے شاعری کی زبان میں مغربی تہذیب کے ایک ایک نقش باطل کو مجاہدانہ روح کے ساتھ مٹایا، لیکن مغرب کی مخالفت میں وہ مشرق کے قدیم و جدید آستانوں پر کچھ دیر کے لیے جھکے، تذبذب کی وادیوں میں بھی بھٹکے، متعدد نظریات حیات کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا لیکن آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ عصر حاضر کے لیے بھی اسلام کا پیغام حیات بخش ہے اور انہوں نے اس کو طرح طرح شاعرانہ اسلوب میں واضح کیا۔

مولانا مودودی دوسری شخصیت جو ابنائے شبلی میں بافتخار شامل ہے وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ہے گو انھوں نے اسلامی تاریخ و تمدن کے سلسلے میں مولانا شبلیؒ کی آراء سے بعض جگہ کلی اور بعض جگہ جزوی اختلاف کیا ہے، کیونکہ ہر غیر معصوم سے یہ اختلاف روا رکھا جا سکتا ہے اور ہر غیر معصوم کے لیے اجتہادی و غیر اجتہادی غلطیوں کا امکان موجود ہوتا ہے، مولانا مودودیؒ نے مغربی تہذیب و تمدن اور قانون و معاشرت

کو تقابلی مطالعہ اور برہانی و استدلالی طریقے سے توڑا اور اسلام کو مدافعانہ پوزیشن سے نکال کر مغربی اور تمام لادینی تہذیبوں پر ہجوم کی شکل میں حملہ کر کے ان کے معائب کو واضح کیا۔ اب سوال یہ نہیں رہا کہ اسلام بزور شمشیر کیوں پھیلا؟ بلکہ سوال اس طرح پیدا ہوا کہ قدیم جاہلی اور جدید تمدنی قوموں نے جنگ میں جو ظلم اور ناانصافی روا رکھی وہ کیوں؟ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے تھے وہ آج تک جدید قوانین نے کیوں عطا نہیں کیے؟ مولانا مودودیؒ نے صرف مجموعی اور عمومی طور پر مغربی تہذیب کے خلاف مضمون نگاری نہیں کی اور نہ نوحہ و ماتم کا شیوہ اختیار کیا بلکہ علامہ شبلیؒ ہی کی طرح متعین موضوعات اور مغربی تہذیب کی شہ رگ پر وار کیا، اصولی مسائل، جہاد، سود، پردہ، حقوق الزوجین، برتھ کنٹرول، اسلامی و مغربی قوانین اور اسلامی نظام زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور فکر و نظر کا اعلیٰ معیار قائم کیا، مغربی جاہلیت جدیدہ کو جاہلیت قدیمہ کا وارث ٹھہرایا اور تمام سامراجی طاقتوں اور حکومتوں کی قانونی بالادستی کے کالعدم ہونے کا اعلان کیا اور ساری زمین پر خدائے رب العالمین کی حکمرانی، خلافت کی پاسبانی اور قانون اسلامی کی بالادستی کا تصور پیش کیا۔

مولانا نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا کوئی غیر مسلم حاکم یا ثالث نکاح کو فسخ کر سکتا ہے، فرمایا تھا:

"سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں، اسکو خدا کا قانون تسلیم کرتا ہے یا نہیں... صرف نکاح و طلاق ہی کے معاملات میں نہیں بلکہ جملہ معاملات میں غیر اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت

کی رو سے غیر مسلّم ہے۔ اسلام نہ ایسی حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک
یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ خود مختارانہ قائم ہوئی اور نہ اس قانون
کو تسلیم کرتا جو کسی انسان یا انسانوں کی جماعت نے بطور خود بنا لیا ہو۔"

حاشیہ میں قانون الٰہی کے اندر رہ کر اجتہاد و استنباط کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"نہ ایسی عدالت کے حقِ سماع و فصلِ خصومات کو تسلیم کرتا جو اصل مالک و فرمانروا
کے ملک میں اس کی اجازت کے بغیر اس کے باغیوں نے قائم کر لی ہو۔ اسلامی
نقطہ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رو سے
ان عدالتوں کی قرار پاگئی ہے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں "تاج" کی
اجازت کے بغیر قائم کی جائیں۔"

حاشیہ میں مولانا نے برما و ملایا پر جاپانی قبضہ کے بعد "آزاد ہند ریاست"
اور "آزاد ہند فوج" قائم ہونے اور اس کے خاتمہ کے بعد تاج برطانیہ کی طرف سے
اس پر مقدمہ چلنے کی تفصیلات پیش کی ہیں، ان عدالتوں کے جج، انکے کارندے
اور وکیل اور ان سے فیصلہ کرانے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی
و مجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں اسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی
نظام مجرمانہ (باغیانہ) ہے جو بادشاہ ارض و سما کی مملکت میں اس کے سلطان (چارٹر)
کے بغیر قائم کیا گیا ہو اور جس میں اس کے منظور کیے ہوئے قانون کے بجائے کسی
دوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو، ایسا نظامِ عدالت جرم مجسم ہے
...اور ان کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں۔"

مولانا کا یہ پورا مضمون حرف بحرف پڑھنے کے قابل ہے جو حقوق الزوجین

ضمیمہ نمبر ۱ میں درج ہے۔ لیکن مجبوری اور اضطراری احوال میں مولانا کے فیصلہ سے
انحراف کی پوری گنجائش ہے تاہم یہ بات اصولی طور پر مسلم ہے کہ خدا کی زمین پر خدا
ہی کا قانون اصل قانون ہے۔ اس سے بڑھ کر برطانوی اور غیر برطانوی قوانین اور
حکومت پر اصولی تنقید میری نظر سے نہیں گزری۔

یہاں مجھے علامہ بدر الدین عینی نیز دوسرے شارحین حدیث کے وہ جملے یاد
آگئے جو انھوں نے شرح صحیح البخاری باب بدء الوحی کی طویل حدیث کی شرح میں لکھے
ہیں، جہاں ہرقل کو "عظیم الروم" لکھنے اور "ملک الروم" نہ لکھنے کی توجیہات پیش
کی ہیں اور یہ لکھا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سارے دنیا کے
بادشاہوں کی بادشاہت ختم اور کالعدم ہوگئی ہے، اب کوئی حقیقی بادشاہ یا حاکم
ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ آپ کی طرف سے بادشاہت یا حکومت کا پروانہ حاصل کرلے۔

علامہ شبلی اہل نظر کی نظر میں

علامہ شبلی پر اہل نظر نے جتنا لکھا ہے اس کو جمع کرنے کے لیے
ایک کتاب درکار ہے، ان کی تعریفیں بھی ہوئیں اور ان پر سخت تنقیدیں بھی ہوئیں
اور یہی ان کی عظمت کی نشانی ہے، اس مختصر مضمون میں مغربی علماء و دانشوروں نے
ان پر جو لکھا ہے ہم اسے قلم انداز کرتے ہیں اور صرف چند ہندوستانی افراد کے اقتباسات
پیش کرتے ہیں، واضح رہے کہ مصر کے مشہور عالم اور عظیم فاضل علامہ رشید رضا مصری
اور عظیم عیسائی مورخ جرجی زیدان نے بھی ان کے علمی و تاریخی تفوق اور اصلاح تعلیم کی
کوششوں کا تذکرہ کیا ہے۔

سرسید کا تبصرہ ہم الجزیہ کے ضمن میں پیش کر چکے ہیں، معاصرین میں مولانا حالی
ان کے بڑے قدرداں تھے اور ڈاکٹر اقبال نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو لکھا ہے کہ

آپ شبلیؒ کے بعد استاذ اکل ہیں۔

مسٹر جارج نے وقف علی الاولاد کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھا تھا علامہ موصوف کا اسلامی جماعت پر بہت بڑا اثر ہے اور ملک کی نظر میں ان کی رائے بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں (فروری و مارچ الھلال ۱۹۱۳ء) "اگرچہ شیخ دس سال تک ازہر کے شیخ الجامعہ رہنے کے بعد بھی اسے ازہر میں جاری نہ کر سکے لیکن شبلیؒ نے اسے ندوۃ العلماء میں عملی جامہ پہنا دیا"۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انہیں "عہد جدید کا معلم اول" اور "قدیم و جدید کا سنگم" مانا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی انہیں "مصنف اور مصنف گر" کا لقب دیتے ہیں۔

شیخ اکرام لکھتے ہیں "حالی، آزاد، محسن الملک، وقار الملک کتنے آسمانوں کے تارے تھے ... ان میں شبلیؒ کی بوقلمونی کہاں سے آئے گی ... قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ ایک معجزہ سے کم ہے"۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں (شبلی نامہ: ۲۰۱) "پرانے رنگ کے علماء شبلیؒ سے ناراض تھے یہی ہمارے نزدیک شبلی کی روشن خیالی، بیدار مغزی اور دوربینی کی دلیل ہے"۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"شبلی کے ... حریفوں کو آج کون جانتا ہے؟ مسلم گزٹ کے جن پرچوں میں انکے خلاف اعتراضات اور الزامات چھپے تھے انہیں سخت تلاش کے بعد بھی حاصل کرنا دشوار ہے۔ لیکن شبلی کے قلم کی ایک ایک سطر موجود ہے اور اردو ادب کا جزو بنتی جاتی ہے، شبلی کے خیالات آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں اور قوم کے دل و دماغ پر انکا سکہ جاری ہے"۔

اقتباسات اور بھی پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن اس مختصر مقالے میں گنجائش نہیں۔

دینؐ کی تبلیغ میں نبی اکرمؐ کا ابلاغی طریقہ کار اور دورِ حاضر میں اس کی معنویت

از ڈاکٹر فضل احمد، کراچی

آج سے پندرہ سو برس پہلے جب دنیا کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی تو بطحا کی سنگلاخ چٹانوں سے رشد و ہدایت کا ماہتاب نمودار ہوا جس نے چند سال کے قلیل عرصے میں مشرق سے مغرب تک دنیا کو منور کر دیا۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین جس قدر سرعت سے روئے زمین پر پھیلا وہ مذاہب کی تاریخ کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے، آپؐ کی وفات کے تیس سال کے اندر اسلام لاکھوں انسانوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا، مشرق و مغرب کی آواز تیغ بر اعظموں کو عبور کر کے فضائے عالم میں گونج رہی تھی، قیصر و کسریٰ کی فوجیں ان بادیہ نشینوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئیں۔

اس تحریک کے اندر وہ کون سا انقلابی طریقہ کار تھا جس نے خون کے پیاسے کو ایک دوسرے کا جان نثار بنا دیا جن بدویوں کو جانور چرانے کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار نہیں تھا وہ قوم و ملت کی قیادت بطریق احسن کرنے لگے، عیسائیت کی تبلیغ صدیوں سے ہو رہی تھی لیکن اب صرف اکا دکا اس کے گروہ کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے، یہودیت نے بھی جو عیسائیت سے کہیں زیادہ طاقتور اور قدیم تھی اپنے

حلقے میں کوئی نمایاں کارکردگی انجام نہیں دے سکی۔

بعثتِ نبویؐ سے قبل مکے کے مشرکانہ مذاہب اور طریقہ ہائے عبادت لوگوں کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھے، قبیلوں کے باہمی تفرقوں اور رقابتوں نے نسلی اور مذہبی اختلافات برپا کر رکھے تھے۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کا حریف تھا، اس پرفتن دور میں بس خال خال افراد ہی حق کی تلاش میں سرگرداں تھے ان کو کسی مردِ حق آگاہ اور نجات دہندہ شخص کی آمد کا انتظار تھا۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اسی ماحول و معاشرہ میں ہوا جو ذہنی اور اخلاقی پستیوں کی حد انتہا کو پہنچ گیا تھا، اس میں اخلاق سازی اور راہنمائی کا فرض آپؐ اس حکم خداوندی کے مطابق شروع کرتے ہیں: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ[1] (پڑھو اپنے خداوند کے نام سے جس نے پیدا کیا)

اس آیت مبارکہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام کی دعوت اور خدائے وحدہٗ لاشریک پر عقیدہ لازم و ملزوم ہے اسی کے نام سے نبوت کے منصب کا آغاز ہو رہا ہے، یہیں سے اخلاق اور عبادات کا نظام جنم لے رہا ہے، گویا ایک ایسا نظام تشکیل پاتا ہے جس کی فلاح و بہبود کی ابتدا خدائے واحد پر ایمان لانے سے اور قدم قدم پر اسی کی مدد و نصرت سے ہوتی ہے۔ گویا اس کے اندر ہر داعی و مبلغ کے لیے یہ پیام مضمر ہے، خدا ہی کی ذات پر انحصار اور اسی کی تائید و امداد سے اسکی تبلیغی جد و جہد اور ساری سرگرمیوں کی ابتدا و انتہا ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلے طور پر دین کی دعوت دینے کا حکم اس طرح دیا:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[2]	اے محمد (صلعم) آپ اپنے نزدیک ترین قرابتداروں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائیے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے:

قام النبی صلعم حین انزل اللہ تعالیٰ "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" فقال یا معشر قریش اشتروا انفسکم من اللہ لا اغنی عنکم من اللہ شیئاً یا بنی عبد مناف لا اغنی عنکم من اللہ شیئاً یا فاطمۃ بنت محمد سلینی ما شئت لا اغنی عنک من اللہ شیئاً[3]	جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اتری تو نبیؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا، اے قریش کے لوگو! اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچاؤ، میں تمہارے کچھ کام نہیں آؤنگا، اے بنو عبد مناف! میں تمہارے کچھ کام نہیں آؤں گا، اے میری بیٹی فاطمہ (دنیا) میں جو چاہو مجھ سے مانگ لو اور اللہ تعالیٰ کے یہاں میں تمہارے کچھ کام نہیں آؤں گا۔

اس آیت مبارکہ اور حدیث شریف سے ایک داعی کو یہ ابلاغی طریقہ سمجھایا گیا ہے اور یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت کو اپنے گھر اور رشتہ داروں سے شروع کرے اور پہلے ان پر توجہ دے، کیونکہ حضورؐ کو خصوصیت کے ساتھ اس بات کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات میں آپؐ کو انذار کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ قُمْ فَاَنْذِرْ	اے (محمدؐ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۔ [1]

اٹھو اور ہدایت کرو اور اپنے خداوند کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دور رہو اور (اس نیت سے) احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو۔

علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہاں ظاہری کپڑا اوڑھنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ اے خلوت و گوشہ نشینی کی چادر اوڑھنے والے کب تک مخفی رہو گے اٹھو اور لوگوں کو متنبہ کرو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ دین کا علم و فہم رکھنے والوں کو صرف اپنی ذات کے دائرے میں محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ انہیں ہر خاص و عام کو دعوت دینی چاہیے وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کہہ کر حکم دیا گیا کہ اپنے رب کی عظمت و شوکت بیان کرو، اس کے آثار حیرت و قدرت کا اظہار کرو تاکہ اس کی قدرت و یکتائی کے تصور سے مشرکین کے دلوں میں اپنے بتوں اور خیالی معبودوں کی وقعت کم ہو اور وہ توحید کی طرف مائل ہوں اور یہ بھی سمجھ لیں کہ نافرمانی پر جو بلا آئے گی اس کو ان کے معبودان باطل کبھی دفع نہ کر سکیں گے۔

اس تفسیر سے ایک ابلاغی انداز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ داعیانِ حق کو اپنے دلائلِ حقہ بیان کرنے میں مخالفین سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنی بات اس انداز سے پیش کریں کہ معبودان باطل کو ماننے والے اپنی شکست تسلیم کر کے معبود حق کی طرف رجوع ہو جائیں وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اپنی ذات و صفات اور اخلاق کو نجاست سے پاک رکھیں کیونکہ ظاہری طہارت کا بڑا اثر قلبی طہارت پر

ہوتا ہے اسی طرح اپنی صفات میں ایسی قبیح حرکتوں کو شامل نہ کریں جو ایک داعی کے شان کے خلاف ہو اور جس سے لوگ قریب ہونے کے بجائے اور متنفر ہو جائیں۔

آگے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ کا حکم دے کر مبلغوں کو سمجھایا کہ تعلیم و تبلیغ اور پند و نصائح کرنے کا احسان نہ جتلانا چاہیے اور اپنے معتقدوں کی کثرت کا آرزو مند اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ لوگوں کی زیادتی سے زیادہ امداد ملے گی۔

اس کے بعد وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ سے لوگوں کی ایذا رسانی اور بدگوئی پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ دعوت و تبلیغ حق کی راہ میں قدم قدم پر حوصلہ شکنی کی باتیں، ہنسی مذاق اور دوستوں اور دشمنوں کے طعن و تشنیع اور ناسازگار ماحول کا سامنا کرنا پڑے گا، ان تمام تکلیف دہ حالات میں اللہ کی رضا کے لیے پیہم صبر کرتا اور اپنے منصب کو انجام دیتا رہے۔ یقیناً یہ وہ ابلاغی طریقہ کار ہے جو ایک ان انسانوں کو اپنی طرف رجوع کر لے گا۔ [2]

ان آیات کے نزول کے بعد آپؐ نے دعوت و تبلیغ کے کام کو مزید وسعت دی، مگر اس کے ساتھ ساتھ دشمنوں کی مخالفتیں بھی شروع ہوتی گئیں، قریش مکہ جو نبوت ملنے سے پہلے آپؐ کو امین و صادق کہا کرتے تھے اب خائن کہنے لگے، جھوٹ و سحر کا الزام لگانے لگے، مگر آپؐ بدگوئی اور ایذا رسانی سے متاثر ہو کر اپنے منصب سے پیچھے نہیں ہٹے۔

ابن اسحاق سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح قبائل عرب کو اسلام کی دعوت دینا شروع کی کہ آپؐ بنفس نفیس قبائل اور اس کے سرداروں کے پاس تشریف لے جاتے اور اللہ کی رحمت و ہدایت کو ان کے سامنے

پیش کرتے۔[۶]

ان واقعات وقصص سے پتہ چلتا ہے کہ جبتک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے منصب پر فائز نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تک مشرکین مکہ نے آپؐ کی شان میں کوئی نازیبا بات نہیں کی بلکہ وہ آپؐ کی مداحی میں رطب اللسان رہتے تھے، مگر جب آپؐ نے یاایھا الناس، قولو الا الہ الا اللہ تفلحوا کہا تو آپؐ کی مخالفت شروع ہوگئی، اس سے معلوم ہوا کہ ایک داعی کو بھی ایسی ہی آزمایش سے دوچار ہونا پڑے گا، ایسے مواقع پر بجائے برانگیختہ ہونے کے محمد مصطفےٰ صلعم کی تعلیمات کو مدنظر رکھے گویا ان واقعات سے ابلاغی صورت کی توضیح وتشریح ہوگئی۔

مندرجہ ذیل آیات سے بھی تبلیغی اصول کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی، اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی، — (محمدؐ) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا اور تم کو

وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی[۷] — کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔

مفسرین سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم ایک دفعہ قریش کے سرداروں کو اسلامی تعلیم دے رہے تھے اور پورے انہماک کے ساتھ ان کی طرف توجہ فرما تھے دل میں خیال تھا کہ کیا عجب اللہ تعالیٰ انہیں اسلام نصیب کرے۔ ناگاہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم آپؐ کے پاس آئے جو مسلمان ہو چکے تھے اور عموماً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور دین اسلام کی تعلیم سیکھتے رہتے تھے۔ آج بھی حسب عادت آتے ہی سوالات شروع کیا اور آگے بڑھ کر حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا، اسوقت حضورؐ چونکہ صناوید قریش کو اسلام کا پیغام پہنچانے میں پوری طرح منہمک تھے اس لیے

ان کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ بلکہ آپؐ کو اس طرح انکا آنا اور سوال کرنا بار خاطر ہوا جس کے اثرات روئے انور سے بھی ظاہر ہونے لگے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ آپؐ کی بلند وبرتر شان اور اعلیٰ اخلاق کے یہ منافی ہے کہ اس نابینا سے جو ہماے خوف سے دوڑتا بھاگتا آپؐ کی خدمت میں علم دین سیکھنے کے لیے آیا تھا آپؐ اس سے منہ پھیر لیں اور ان لوگوں کی طرف التفات فرمائیں جو سرکش مغرور اور متکبر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تبلیغ دین میں شریف وضعیف، فقیر وغنی، آزاد وغلام مرد وعورت، چھوٹے بڑے سب برابر ہیں، سب کو یکساں نصیحت کی جائے، ہدایت[ع] خدا کے ہاتھ میں ہے وہ اگر کسی کو راہ راست سے دور رکھے تو اس کی حکمت وہی بہتر جانتا ہے

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ[۸] — اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو) سمجھاتے رہیے کیونکہ سمجھانا ایمان والوں کو نفع دے گا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے قرآن پاک کی آیات سنا کر نصیحت کرنا مقصود ہے

ع معارف: ان آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطے سے آپؐ کی امت کو تبلیغ و دعوت کے اس طریقہ سے مطلع کیا گیا ہے کہ رؤسائے قریش کے ایمان لانے کی توقع میں آپؐ انکی طرف غیر معمولی التفات فرماکر ان ضعفائے مسلمین کی اصلاح وتربیت کیجانب سے بے توجہی اور غفلت نہ اختیار کریں۔ انکے مقابلہ میں آپؐ کے التفات فراواں کے اصل مستحق یہ خستہ حال مومنین ہی ہیں جو تزکیہ وہدایت کی طلب میں مخلص ہیں رہے وہ امراء ورؤسا جنکے ایمان لانے کی امید ہی نہ ہو یا امید موہوم ہو انکے پیچھے اپنی قوت ووقت صرف نہ کریں۔

کہ وہ مومنین کے لیے نفع رساں ہے تو ظاہر ہے کفار کے لیے بھی اس لحاظ سے کہ وہ انشاء اللہ
اس کے ذریعے مومنین میں داخل ہو جائیں گے اور آیت کے مصداق میں شامل ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کی ایک آیت یوں آئی ہے جس کے سمجھنے پہ تبلیغی انداز کے سمجھنے کا
دار و مدار ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ
قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ
مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر
وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ ان کو
سمجھائے پھر راستہ بھلاتا ہے اللہ
جس کو چاہے اور راستہ دکھاتا ہے
جس کو چاہے اور وہ زبردست
حکمتوں والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اسے اس قوم کا ہم زبان
بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کو ان ہی کی زبان میں اور ان ہی کے محاورات میں بتلائے
اور قوم کے لیے ان کا سمجھنا آسان ہو لیکن اگر رسول کی زبان امت کی زبان سے مختلف
ہو تو ظاہر ہے کہ اسے اس کو ترجمہ کرانے کی مشقت اٹھانا پڑتی جس کے بعد بھی احکام کو
صحیح سمجھنا مشکوک رہتا اس لیے اگر اللہ نے عبرانی بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا
تو رسول کی زبان بھی عبرانی بنائی اور فارسیوں کے رسول کی زبان فارسی۔

ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکان کے اعتبار سے پوری دنیا
کے لیے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لیے ہے، دنیا کی کوئی قوم خواہ وہ
کسی ملک کی رہنے والی یا کوئی بھی زبان بولنے والی ہو آپ کے دائرۂ رسالت سے

باہر نہیں۔ جب رسولؐ کی بعثت اور دعوت دنیا کی تمام اقوام کے لیے عام ہے
جن میں سینکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لیے دو ہی صورتیں ممکن تھیں،
ایک یہ کہ قرآن مجید ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا اور رسول کریمؐ کی تعلیمات و
ہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کیلئے
یہ انتظام مشکل نہ تھا لیکن تمام اقوام عالم کے لیے ایک رسول، ایک کتاب، ایک شریعت
اس لیے بھیجی گئی کہ ہزاروں اختلافات کے باوجود ان میں دینی، اخلاقی اور معاشرتی وحدت
اور یکجہتی پیدا ہو اور یہ عظیم الشان مقصد اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ آپؐ
کی دعوت و تبلیغ کی وجہ سے عرب و عجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک و قوم اور ہر زبان بولنے
والوں میں ایسے علماء پیدا ہو گئے جنھوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی اپنی قومی
زبان میں نہایت سہولت کے ساتھ پہنچایا اور رسولؐ کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت
تھی وہ حاصل ہو گئی۔

محمد مصطفیٰ صلعم نے دنیا کی قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر
رکھا اور خدا کے پیغام کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا اس لیے آپؐ نے اپنی تبلیغ کے لیے
قریش، غیر قریش، حجاز، یمن، عرب، عجم کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر
زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہوئی کہ ایک مبلغ کو اپنی تبلیغ میں رنگ و نسل کے
امتیازات کو مٹا دینا چاہیے جو بھی طالب حق آئے اس کا تعلق کسی بھی زبان، ملک، قوم
سے ہو اسے جتنا نفع پہنچا سکتا ہے پہنچائے، اسلام نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر
اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا اور

مسلمانوں کا یہ فرض بتایا کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	تم بہترین امت ہو جو بھیجی گئی ہے عالم
لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	میں، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ	منع کرتے ہو برے کاموں سے اور
بِاللّٰهِ [۱۲]	ایمان لاتے ہو اللہ تعالیٰ پر۔

گویا دوسری امتوں سے ممتاز ہونے کی جہاں متعدد وجہیں ہیں وہاں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسانیت کو اس کے خالق کی طرف بلانے کا منصب عطا کیا گیا یقیناً یہ فضیلت ایک داعی کو اپنے داعیانہ کام میں ہمت، حوصلہ اور بلند ارادہ جیسی صفات عنایت کر دے گی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیام الٰہی لوگوں تک پہنچایئے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہ دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ	اے اللہ کے رسول پہنچا دیجئے لوگوں
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ	کو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اتارا
تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ	ہے اگر تونے ایسا نہ کیا تو تم نے
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ [۱۳]	اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھکو
	خدا لوگوں سے بچالے گا۔

اس آیت مبارکہ سے ایک داعی کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ ابتداءً وہ علوم سیکھے جو

حضرت محمد صلعم پر نازل ہوئے، یعنی قرآن حدیث وغیرہ پھر سیکھنے کے بعد اس علم کا حق یہ ہے کہ اسکو دوسروں تک پہنچائے۔ ایک اور جگہ ارشاد باری ہے:۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	اپنے پروردگار کی راہ کی طرف
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ [۱۴]	ذریعے سے بلائیں اور ان سے مناظرہ
	خوش آیند طریقے سے کیا کریں۔

تبلیغ و دعوت کے یہ تین [۳] اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے۔ جب ہم کسی کے سامنے کوئی بات پیش کر کے اس کو قبول کرنے کی اسے دعوت دیتے ہیں تو عموماً یہی تین طریقے استعمال کرتے ہیں، اس بات کے ثبوت و تائید میں کچھ دلنشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور موثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا اس کی دلیلوں کو مناسب طریقے سے رد کر کے اس کی غلطی اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقے کا نام حکمت دوسرے کا نام موعظۂ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے، اسلام نے دعوت و تبلیغ کے یہی طریقے بتلائے ہیں۔

اس تشریح سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کریں، سختی اور شدت کا طریقہ دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے جن کے تحت اچھی اور حق بات کو بھی مسترد کر دیا جاتا ہے، اس طرح دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے، اسی لیے قرآن حکیم نے اپنے پیغمبر کو مخالف اور دشمن سے بھی نرمی برتنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت

ہارونؑ کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لیکر جانیکی ہدایت ہوتی ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوتا ہے:

اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۱۵؎

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (خدا سے) ڈرے۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و تحمل اور حلم و بردباری کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی سرکش ہو سکتا ہے۔ پھر ایسے مجرم و سرکش کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعیوں، مبلغوں اور واعظوں کو تمام مخالفین، مجرمین اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کے بارے میں جو آپؐ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے تھے یہ حکم ہوتا ہے:

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ۱۶؎

تو ان سے درگذر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کر جو انکے دلوں میں اثر پیدا کرے۔

اس تعلیم میں دعوت و تبلیغ کے تین طریقوں کو بیان کیا گیا، اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفین کی بدتہذیبی اور درشتی سے درگذر کرنا چاہیے، دوسرے یہ کہ انکو نصیحت کرنا چاہیے اور شیریں کلامی سے سمجھانا چاہیے، تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ موثر انداز ہو جو مخالفین کے دل میں جگہ پیدا کرے۔ ایک حدیث میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے:

یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا ۱۷؎

یعنی آسانیاں پیدا کیجئے، مشکلات نہ پیدا کیجئے، خوشخبری سنایا کیجئے، اور لوگوں کو متنفر مت کیا کیجئے۔

یہ وہ تبلیغی طریقہ ہے جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی کلید ہے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے سامنے اور انہوں نے عام مسلمانوں کے سامنے انہی اصولوں کے مطابق دین الٰہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پرامید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو مایوس اور خوفزدہ بنایا جائے۔

تبلیغ کا ایک اور اصول حضور اقدس صلعم کی تعلیم سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ انکو اس کے سامنے پیش کیا جائے، پہلے توحید و رسالت کو پیش کیا جائے اس کے بعد عبادات اور ان میں بھی اہم فالاہم کو مدنظر رکھا جائے، اس حدیث سے یہ مضمون واضح ہوتا ہے:

عن ابن عباسؓ ان معاذاً قال بعثنی رسول اللہ صلعم فقال انک تاتی قوماً من اھل الکتاب فادعھم الی شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ فان ھم اطاعوا

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ مجھے حضورؐ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو فرمایا جب تمہاری اہل کتاب سے ملاقات ہو تو پہلے انکو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت

لذالك فاعلمهم ان الله
افترض عليهم خمس صلوات فی
كل يوم وليلة فان هم اطاعوا
لذالك فاعلمهم ان الله افترض
عليهم صدقة توخذ من
اغنيائهم فترد الى فقرائهم
فان هم اطاعوا لذالك
فاياك وكرائم اموالهم
واتق دعوة المظلوم فانه
ليس بينها وبين الله حجاب

اور میری رسالت کی شہادت کی دعوت
دینا جب وہ اسے مان لیں تو انہیں بتاؤ
کہ اللہ نے ان پر دن اور رات میں
پانچ نمازیں فرض کی ہیں جب وہ یہ بھی
مان لیں تو انہیں بتلانا کہ اللہ تعالیٰ
نے ان پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے۔ جو
انکے دولتمند لوگوں سے لے کر انکے
فقراء میں تقسیم کی جائے گی، جب وہ
اس کو قبول کر لیں تو تم زکوٰۃ میں انکا
بہترین مال ہرگز نہ لینا کیونکہ مظلوم کی
بدعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب
نہیں ہوتا۔

اس حدیث سے یہ سبق ملا کہ دعوت و تبلیغ کا کام جذباتی نہیں ہے کہ اسے بغیر کسی اصول و ضابطہ کے کیا جائے بلکہ ہوش و خرد کے ساتھ مخاطب کے احوال کو مدنظر رکھتے ہوئے کرنا ہے، اسلام کی دعوت موثر انداز میں دینا چاہیے۔

اسلام کی شاندار کامیابی اور لوگوں کے دلوں پر اس کی حیرت انگیز حکومت نے اس کو اس الزام کا مورد بنا دیا ہے کہ وہ تلوار کا مذہب ہے چنانچہ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "اسلام کی اشاعت تلوار سے ہوئی ہے اور اسی کے بل بوتے پر اس کو قائم رکھا گیا ہے۔"

جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو قعر ذلت سے نکالنے اور خبائث سے پاک

کرنے کے مقدس عمل میں مصروف تھے تو آپ صلعم کے دشمن آپؐ سے انتقام لینے کے منصوبے تیار کر رہے تھے، وہ آپ صلعم کو ہلاک کرنے اور دین الٰہی کو تباہ کرنے کا عزم مصمم کئے ہوئے تھے، قریش آپؐ کو اور آپؐ کے متبعین کو اپنا آبائی مذہب ترک کر دینے کی وجہ سے مرتد شمار کرتے تھے، انہیں یہ امر بہت کھٹکتا تھا کہ ان مرتدوں نے مکہ کے حریف شہر میں پناہ لے رکھی ہے تاکہ وہاں رہ کر اپنے انقلابی مذہب کو پروان چڑھائیں اسی لیے ان کے نزدیک متحدہ عرب کا یہ فرض تھا کہ ان سر پھرے اور پرجوش لوگوں کو نیست و نابود کر دیں جنھوں نے اپنے گھر بار اور مال و دولت کو اس مقصد سے خیرباد کہا تھا کہ ایک ایسے ان دیکھے خدا کا پیغام دنیا کو پہنچائیں جو اپنی عبادت کے معاملے میں اتنا سخت گیر تھا کہ دوسروں کی شرکت برداشت نہیں کرتا تھا۔

عرب کے تمام قبائل قریش کے لیے گوش برآواز رہتے تھے کیونکہ وہ ان کے ان خداؤں کے قدیم خادم تھے جن کے منکروں کو مٹانے کا وہ بیڑا اٹھائے ہوئے تھے، ایسی صورت میں اگر آپؐ اور آپؐ کے جاں نثار اپنے تحفظ کے لیے تلوار ہاتھ میں نہ لیتے تو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، پھر بھی جب تک ان داعیان حق کے دشمن پیش قدمی کر کے ان پر حملہ آور نہیں ہوئے، اس وقت تک یہ اعلان نہیں ہوا کہ چونکہ کفار مومنوں کے معاملے میں خون کے رشتے اور عہد و پیمان کا خیال نہیں رکھتے نیز انہوں نے صلح کے معاہدے توڑ دیے ہیں اس لیے تم بھی ان پر حملہ آور ہو کر اپنی حفاظت کرو۔

ارشاد ربانی ہے:۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ
وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ ۔

اور لڑو ان سے یہاں تک کہ فساد باقی
نہ رہے اور صرف اللہ تعالیٰ کا مجوب

دین ہی رہ جائے۔

مسلمانوں کے لیے مدافعانہ کارروائی اپنے تحفظ کا معاملہ بن گئی ان کے لیے دو ہی صورتیں تھیں یا تو دشمنوں کے آگے اپنا سر رکھ دیں یا حملہ آور دشمنوں کا مقابلہ کریں۔ انھوں نے آخر الذکر طریقہ اختیار کیا اور ایک طویل کشمکش کے بعد دشمنوں پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوئے۔

جو قانون سرتاپا امن پسندی، سلامت طبعی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے، اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا کہ آنحضرتؐ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، مندرجۂ ذیل واقعہ سے اس کے صدق و کذب کی وضاحت ہو جائے گی۔

اسامۃ بن زید بن حارثۃ یحدث: قال بعثنا رسول اللہؐ الی الحرقۃ من جھینۃ فصبحنا القوم فھزمناھم قال ولحقت انا ورجل من الانصار رجلا منھم فلما غشیناہ قال لا الہ الا اللہ قال فکف عنہ الانصاری وطعنتہ برمحی حتی قتلتہ قال فلما قدمنا بلغ ذالک النبی صلعم فقال

حضرت اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ہمیں جہاد کے لیے حرقہ کی طرف روانہ کیا جو قبیلہ جہینہ کی ایک شاخ ہے، ہم صبح وہاں پہنچ گئے اور ان کو شکست دیدی میں نے اور ایک انصاری نے مل کر ایک شخص کو پکڑ لیا جب وہ ہمارے حملہ کی زد میں آگیا تو اس نے کہا لا الہ الا اللہ، انصاری تو کلمہ سُن کر الگ ہو گیا لیکن میں نے نیزہ

لی یا اسامۃ اقتلتہ بعد ما قال لا الہ الا اللہ قال قلت یا رسول اللہ انما کان متعوذاً قال فقال اقتلتہ بعد ما قال لا الہ الا اللہ قال فما زال یکررھا علی حتی تمنیت انی لم اکن اسلمت قبل ذالک الیوم ۲۰

مار کر اس کو ہلاک کر دیا جب ہم واپس آئے تو حضورؐ کو بھی اس واقعہ کی خبر ہوئی آپؐ نے مجھ سے فرمایا تم نے کلمہ پڑھنے کے باوجود قتل کر ڈالا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اس نے جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا، حضورؐ نے پھر فرمایا تم نے کلمہ پڑھنے کے باوجود اس کو قتل کر ڈالا اور حضورؐ یہ کلمات بار بار دہراتے رہے اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں آج سے پہلے اسلام نہ لایا ہوتا۔

جنگ کے اس اصول سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزورِ شمشیر مسلمان بنا لینا، یہ واقعہ مغربی فکر و لٹریچر سے ان مرعوب ذہنوں اور مستشرقین کے پیروؤں کا عمدہ جواب ہے جو اسلام کو تشدد پسند مذہب کے نام سے یاد کرتے ہیں، قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۲۱

اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سُن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

آیت مذکورہ میں کلامِ الٰہی سُننے کے بعد اگر کوئی شخص مسلمان نہ ہوا تو اسے قتل کر کے جہنم رسید کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسے اپنی جائے امن میں پہنچانے کی تلقین کی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے امن پسندی اور رواداری کو کیسی اہمیت دی ہے، یہاں تک کہ اس نے ان مشرکوں سے بھی لڑنے کو منع کیا جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلے کے دوست ہوں اور صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ	تو اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں
وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا	تو پھر نہ لڑیں اور اگر وہ تمہارے
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا	سامنے صلح کرنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ
	نے تم کو حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنیٰ ہوتے کہ "تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی صلح جوئی اور ترک جدال کی صورت ممکن ہو سکتی تھی؟

اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال رکھا جائے بلکہ تلوار اٹھانے سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کی جائیں، اول یہ کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں اور بھائی بن جائیں اگر ایسا کریں تو وہ حکومت دین اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جائیں گے اور اگر یہ انہیں منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہکر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لیں اس صورت میں انکی حفاظت ہمارے ذمے ہو گی ان دو باتوں میں سے کوئی بات قبول کر لینے کے بعد ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں اس کی کتنی مثالیں موجود ہیں کہ کسی دشمن نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی تو خونریزی

اور جنگ بند ہو گئی اور رزم کا میدان محبت و اخوت کی بزم بن گئی، حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین فرماتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے:

واذا لقيت عدوك من المشركين	یعنی جب مشرکوں میں سے کسی دشمن
فادعهم الى ثلاث خصال فايتهن	قوم سے مقابلہ ہو تو اس کو تین باتوں
ما اجابوك فاقبل منهم وكف عنهم	میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنیکی
ثم ادعهم الى التحول من دارهم	دعوت دو ان میں سے جو بات بھی وہ ان
الى دار المهاجرين واخبرهم	لیں اس کو قبول کر لو اور اس پر تلوار
انهم ان فعلوا ذلك فلهم ما	نہ اٹھاؤ، اس کے بعد ان سے خواہش
للمهاجرين وعليهم ما	کرو کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائیں
على المهاجرين فان ابوا ان	تو ان کا وہی حق ہو گا جو مسلمانوں کا ہے
يتحولوا منها فاخبرهم انهم	اگر وہ نہ مانیں تو ان کی حالت بدو مسلمانوں
يكونون كاعراب المسلمين	کی سی ہو گی، قانون مسلمانوں کا جاری
يجري عليهم حكم الله	ہو گا لیکن غنیمت اور فئی میں ان کا
الذي يجري على المومنين	حصہ نہ ہو گا جب تک کہ وہ جہاد کریں
ولا	اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو انہیں
يكون لهم في الغنيمة والفيء	جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہو اگر وہ
شيء الا ان يجاهدوا مع المسلمين	اس کو مان لیں تو قتال سے رک جاؤ
فان هم ابوا فسلهم الجزية	اگر وہ اس کو بھی نہ مانیں تو پھر خدا کی
فان هم اجابوك فاقبل منهم	مدد مانگ کر لڑائی شروع کر دو۔

وکف عنھم فان ھم ابوا فاستعن

باللہ وقاتلھم[۲۳]

یہ وہ ابلاغی طریقہ تھا جس سے قبیلے اور قوم اسلام کی جانب بغیر کشت و خون کے کھنچے چلے آرہے تھے۔ دعوت و تبلیغ کے وہ اصول جو صحابہؓ نے اختیار کیے تھے اگر ان پر طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دین کی اشاعت کے سلسلے میں وہ مخاطبین و سامعین کی طبیعت و مزاج کو بھی سامنے رکھتے تھے مثلاً ایک حدیث ہے :

عن ابی وائل قال کان عبد اللہ
یذکر الناس فی کل خمیس فقال
لہ رجل یا ابا عبد الرحمٰن
لوددت انک ذکرتنا کل یوم
قال اما انہ یمنعنی من ذلک
انی اکرہ ان املکم و انی
اتخولکم بالموعظۃ کما کان
النبی صلعم یتخولنا بھا
مخافۃ السآمۃ علینا[۲۴]

حضرت ابو وائلؓ فرماتے ہیں کہ عبداللہ
بن مسعودؓ ہر جمعرات کو لوگوں کے سامنے
وعظ کرتے تھے، ایک شخص نے کہا
ابو عبدالرحمٰن، میری خواہش ہے کہ
آپ ہمیں ہر روز وعظ کیا کریں فرمایا
روزآنہ وعظ میں یہ امر مانع ہے کہ
کہیں تم اکتا نہ جاؤ اور میں نے تمہاری
نصیحت کے لیے اسی طرح مقرر کیا ہے،
جس طرح رسول اللہؐ نے لوگوں کو وعظ
کرنے کے لیے وقت مقرر کیا تھا کہ
کہیں ہم اکتا نہ جائیں۔

اس حدیث سے یہ بات عیاں ہوئی کہ داعی و مبلغ کو سامعین اور مخاطبین کے احوال کو مدنظر رکھنا چاہیے اور آسانی و سہولت کے ساتھ دین کی تعلیم کو آگے بڑھانا چاہیے۔

جو شخص امت محمدیہ صلعم کو کسی نیک کام کی طرف بلاتا ہے اور اس کے بلانے کی وجہ سے دوسرے اشخاص نیک عمل کرتے ہیں تو ان لوگوں کے ثواب میں کمی کیے بغیر بلانے والے کو اس کا ثواب ملتا رہے گا، آپؐ کا ارشاد ہے :

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال
من دعا الی ھدی کان لہ
من الاجر مثل اجور من تبعہ
لا ینقص ذالک من اجورھم
شیئاً و من دعا الی ضلالۃ
کان علیہ من الاثم مثل
آثام من تبعہ لا ینقص ذالک
من آثامھم شیئاً[۲۵]

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ
نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص ہدایت
کی طرف بلائے اسے ہدایت پر چلنے
والوں کا بھی ثواب ملے گا اور چلنے
والوں کے ثواب میں کسی قسم کی کمی
نہیں کی جائے گی اور جو شخص گمراہی
کی طرف بلائے اس پر گمراہی میں چلنے
والوں کا بھی گناہ ہوگا اور ان چلنے
والوں کے گناہ میں بھی کسی قسم کی کمی
نہیں کی جائے گی۔

محمد عربیؐ کا یہ فرمان ایک داعی و مبلغ کو ہمت، ولولہ اور شوق فراہم کرتا ہے کیونکہ جب اس کے قلب میں یہ بات سما جائے کہ میرے اقوال اور میری تقریریں اور میری تگ و دو کا ثمرہ آخرت میں ان لوگوں کے اعمال کی وجہ سے بھی ملے گا جنھوں نے اس کی دعوت کے نتیجہ میں کوئی کار خیر کیا ہوگا یا اس کی تلقین سے ان کو اپنے گناہوں پر ندامت ہوئی ہوگی اور وہ اس کی وجہ سے ان سے باز آئے ہوں گے۔

اس حدیث میں ایک ابلاغی پہلو یہ بھی ہے کہ داعی اور مبلغ مایوسی اور کم ہمتی کے وقت

اس حدیث کو ذہن نشین کرے تو اس کے دل میں امید کے دیے روشن ہو جائیں گے اور وہ پہلے سے زیادہ مستعد و منہمک ہو جائے گا۔

سطور بالا میں دین کی تبلیغ میں نبی اکرمؐ کے ابلاغی طریقوں اور اصولوں کا جائزہ لیا گیا ہے، عصر حاضر میں روس کی تباہی و بربادی کے بعد نو آزاد ریاستوں کے قیام اور دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے دور حاضر میں تبلیغ دین کے امکانات اور ضرورت و اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے مزید یہ کہ عصر حاضر کی بڑھتی ہوئی لادینی شورشوں اور تباہ کن ثقافتی یلغاروں کے دفاع اور حقانیت دین حنیف کے اثبات و اشاعت کے نقطۂ نظر سے بھی اسکے امکانات نہایت ہی روشن اور وسیع ہیں۔

دور حاضر میں عالم اسلام میں عموماً اور برصغیر پاک و ہند میں خصوصاً جو دینی قوتیں و جماعتیں اس اہم دینی فریضہ کی تکمیل میں مصروف ہیں اگر انکا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں نبی اکرمؐ کے ابلاغی اسلوب اور طریقے مثلاً وسیع النظری رواداری، حکمت و موعظت اتحاد و یگانگت، احسن مجادلہ، ضبط و تحمل، اخلاص و تقویٰ اور تکریم انسانیت کا بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے، کیونکہ یہ ساری جماعتیں اپنے اپنے مکتب و مسلک کے عقائد و نظریات کی تبلیغ میں مصروف ہیں، ان میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے عقائد و نظریات اور خیالات کو سن کر برداشت کر سکیں، جس کا نتیجہ یہ ہے مسلمان گروہوں، فرقوں، مسلکوں اور مکتبوں کی حدود میں محدود ہوتے جا رہے ہیں اور اسلام کا آفاقی اور عالمگیر پیغام محدود ہوتا جا رہا ہے، مسلمان ملکوں اور مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی نظام کا عملی نفاذ نہ ہو سکنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے۔

لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام دینی جماعتیں ایک متفقہ منصوبۂ تبلیغ پر جو کہ اسلام کی اساسی تعلیمات پر مشتمل ہو متحد ہو جائیں اور پوری قوم کو صرف اور صرف دین حنیف کی دعوت دیں۔

اگر ہماری دینی جماعتیں باہم متحد ہو گئیں تو انشاء اللہ اسلامی نظام کے عملی نفاذ میں دنیا کی کوئی بھی طاغوتی قوت حائل نہ ہو سکے گی۔

حوالے

۱ القرآن، العلق: ۱ ۲ ایضاً، شعراء: ۲۱۴ ۳ ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی، سنن دارمی، ج ۲، ص ۲۱۵، کتاب الرقاق باب ۲۳، وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ، نشر السنۃ ملتان، پاکستان ۴ القرآن، المدثر: ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ ۵ ابو محمد عبدالحق حقانی، تفسیر حقانی، ج ۷، ص ۲۵۹، مکتبۃ الحسن لاہور ۶ محمد بن اسحٰق، سیرۃ ابن اسحاق، بحوالہ نقوش رسول نمبر ج ۱۱، ص ۲۴۹، باب ۳۱، قبائل عرب کو دعوت، شمارہ نمبر ۱۳۰، جنوری ۱۹۸۵ء، ادارہ فروغ اردو لاہور ۷ القرآن، العبس: ۱ تا ۳ ۸ ایضاً، الذاریات: ۵۵ ۹ القرآن، ابراہیم ۴ ۱۰ محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، ج ۵، ص ۲۱۲، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۹۸۰ء ۱۱ القرآن، آل عمران: ۱۱۰ ۱۲ ایضاً، المائدہ: ۶۷ ۱۳ ایضاً، النحل: ۱۲۵ ۱۴ ایضاً، طٰہٰ: ۴۳، ۴۴ ۱۵ ایضاً، النساء: ۶۳ ۱۶ محمد بن اسمٰعیل بخاری، صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۲۷، کتاب العلم باب ما کان النبی صلعم یتخولہم بالموعظۃ الحسنۃ کی لا ینفروا، ناشر حامد اینڈ کمپنی، مدینہ منزل ۳۸، اردو بازار لاہور، ایڈیشن بار اول ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء ۱۷ مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب الایمان باب الدعاء الی شہادتین و شرائع الاسلام، ج ۱، ص ۱۱۱، فرید بک اسٹال، اردو بازار لاہور ۱۸ القرآن، البقرہ: ۱۹۳ ۱۹ مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر

بعد قولہ لا الہ الا اللہ، ج ۱، ص ۱۹۹ ؎۲۰ القرآن، التوبہ: ۶ ؎۲۱ ایضاً، النساء: ۹۰

؎۲۲ مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الجہاد، والسیر باب تامیر الامام الامراء علی البعوث ووصیتہ، ایاہم بآداب الغزو، ج ۲، ص ۸۳۴، قرآن محل، مولوی مسافر خانہ، کراچی۔ باہتمام محمد سعید اینڈ سنز ؎۲۳ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، کتاب العلم باب من جعل لاہل العلم ایاماً معلومۃً، ج ۲، ص ۱۲۷ ؎۲۴ مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب العلم باب من سن سنۃ حسنۃ او سیئۃ ومن دعا الی ہدیً او ضلالۃٍ، ج ۲، ص ۷۹، قرآن محل، کراچی۔

سلسلہ سیرۃ النبیؐ

از علامہ شبلیؒ و مولانا سید سلیمان ندویؒ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات، تعلیم و ارشاد کے اس عظیم الشان کتابی ذخیرہ کو مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ سات جلدوں میں مرتب کیا گیا ہے، پہلی جلد میں ولادت باسعادت سے فتح مکہ، دوسری میں اقامت امن، خلافت، تکمیل شریعت، وفات اور اخلاق و عادات نبویؐ اور دعوت و تبلیغ کے طریقے کا مفصل بیان ہے حصہ سوم میں معجزہ کی حقیقت اور اسکا امکان و وقوع اور خصائص نبوت پر مکمل بحث و تبصرہ ہے حصہ چہارم میں منصب نبوت کی تشریح کیساتھ تبلیغ نبوت کے اصول اور حضور اکرمؐ کے پیغمبرانہ طریق کار پر نہایت مفصل بحث کی گئی ہے حصہ پنجم کا موضوع عادات اور جلد ششم اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے ساتویں جلد میں اسلام کے طرز حکومت کا بیان ہے پہلی جلد کے مقدمے میں ابتدائی عہد کے سیر و مغازی کے مصنفین کا تذکرہ اور اہم کتب سیر پر تبصرہ بھی ہے۔

قیمت جلد اول ۶۰/-، دوم ۵۰/-، سوم ۱۲۵/-، چہارم ۱۲۵/-، پنجم ۶۰/-، ششم ۱۲۵/-، ہفتم ۳۵ روپیے

"منیجر"

دینی مدارس کے اساتذہ اور فن تعلیم و تربیت

از جناب مظفر حسین غزالی صاحب، دہلی۔

تعلیمی نظام میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جس کا کام نوخیز نسل تک علمی ورثے کو منتقل کرنا ہوتا ہے، یہ بذات خود ایک بڑی ذمہ داری ہے جس کو انجام دینے کے لیے یقیناً نوخیز نسل کے ذہن، اس کے میلان، دلچسپی اور پسند و ناپسند سے واقفیت استاد کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ سیکھنے والوں کو جو سکھانا چاہتا ہے، نہیں سکھا سکتا، مثلاً جس وقت طلبہ کھیل تفریح کے موڈ میں ہوں اگر ایسے وقت میں استاد ان کو کوئی علمی مسئلہ یا نکتہ سمجھائے تو اس کی باتوں میں طلبہ کوئی دلچسپی نہیں لیں گے ایسی صورت میں ممکن ہے استاد کو طلبہ پر غصہ آجائے اور وہ انہیں سزا دیدے تو کیا اس میں خود استاد کی غلطی نہیں ہے کہ وہ طلبہ کی خواہش کو نہیں سمجھ سکا، اگر وہ اس وقت طلبہ کی مرضی کو دیکھ کر اس کے مطابق انہیں کچھ سکھاتا اور بتاتا، بچوں کی تعلیم میں حکمت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، حکمت انگریزی لفظ TECHNIC کے قریب المعنی ہے اسی کو ماہرین تعلیم نے طریقہ سے موسوم کیا ہے۔ پھر اس میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ کس عمر اور کس سطح کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے کس طریقے کو اختیار کیا جائے، کیونکہ ہر عمر اور ہر سطح کے بچوں کی دلچسپیاں دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح انکے ذہنوں میں بھی فرق ہوتا ہے، استاد کو سبق شروع کرنے سے پہلے یہ اندازہ ضرور ہونا چاہیے کہ

وہ جن کو پڑھانے جا رہا ہے ان کا ذخیرۂ الفاظ اور ذہنی سطح کیا ہے۔ جب یہ اندازہ ہو جائے گا تو اسے یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ سبق کے کن مباحث کو کس طرح رکھنا چاہیے تاکہ طلبہ کی دلچسپی سبق میں قائم رہے۔ پھر سبق کو شروع کرنے سے پہلے اس کی تمہید کس طرح باندھنی چاہیے اس کا فیصلہ کرنا بھی استاد کو آسان ہوگا۔ ایک معروف طریقہ یہ ہے کہ جانی پہچانی چیزوں کی مدد سے انجانی چیزوں کو سکھایا جائے۔ مثلاً ایک بچہ کتے کو جانتا ہے۔ اسے گیدڑ کے بارے میں بتانا ہے تو کتے کی مدد سے اسے بتایا جا سکتا ہے کہ گیدڑ اس سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔

عصری درسگاہوں میں اپنائے جانے والے تدریسی طریقے

عصری درسگاہوں میں تدریس کے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں اس بات پر زور ہوتا ہے کہ طلبہ تجربات و مشاہدات اور مطالعہ سے خود واقعات و حقایق سے دوچار ہوں اور پھر انکا تجزیہ کر کے کسی خاص نتیجے پر پہنچیں۔ اس کے لیے متعدد طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

۱۔ استقرائی طریقۂ تدریس:۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یعنی طلبہ متعدد واقعات، حقایق یا مثالوں کا تجزیہ کر کے براہ راست کسی نتیجے پر پہنچے اور کوئی اصول ضابطہ یا کلیہ اخذ کرتے ہیں۔ اس طریقہ میں طلبہ سبق میں عملی دلچسپی لیتے ہیں اور ہمہ تن مصروف رہتے ہیں اس کی وجہ سے ان میں غور و فکر، استدلال اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، خود اعتمادی بڑھتی ہے اور تحقیق و جستجو کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ البتہ استاد کی نگرانی ضروری ہوتی ہے کیونکہ صحیح نگرانی اور رہنمائی نہ ہونے کی صورت میں بسا اوقات طلبہ چند مخصوص واقعات یا مثالوں سے کوئی کلیہ بنا لیتے ہیں حالانکہ دوسری بہت سی مثالوں پر اسکا انطباق نہیں ہوتا۔

۲۔ استخراجی طریقہ تدریس:۔ یہ طریقہ استقرائی کی ضد ہے اس میں معلم خود ہی طلبہ کو کوئی عام اصول، ضابطہ یا کلیہ بتا دیتا ہے اور مخصوص مثالوں سے اس کی وضاحت کر دیتا ہے، اس طریقے میں طالب علم کی حیثیت مجہول سامع کی ہوتی ہے اس لیے وہ سبق میں عملی دلچسپی نہیں لے پاتا، البتہ اس میں استاد کا کام آسان ہوتا ہے کہ وہ طلبہ کو اپنے تجربے اور علم کی بنیاد پر کوئی قاعدہ یا اصول بتا دیتا ہے اور طلبہ اسے یاد کر کے متعدد مسائل اس کی مدد سے حل کرتے رہتے ہیں، یہ طریقہ پختہ ذہن اور بڑی عمر کے طلبہ کے لیے مفید ہے۔ اس میں کم وقت میں زیادہ معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ تحقیقاتی طریقے میں طلبہ کو خود تجربہ و مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس میں طلبہ عملی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس طریقہ سے جو علم انہیں حاصل ہوتا ہے اسے وہ زندگی بھر نہیں بھولتے۔ وہ علم مستحکم ہوتا ہے اور انہیں اس پر بھروسہ بھی ہوتا ہے۔ اس سے طلبہ میں جستجو اور تحقیق کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان میں مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ کنڈر گارٹن طریقہ (بچوں کا باغ) اور مانٹیسری طریقہ بہت چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مفید ہے۔ ان دونوں طریقوں میں کھیل کے ذریعہ تعلیم پر زور ہوتا ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچوں کی مختلف ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لیے مختلف دلچسپ کھیلوں میں بچوں کو مصروف کیا جائے، اس طریقے سے رسمی تعلیم کے لیے بچہ تیار ہو جاتا ہے اور اس کا علم اس سطح پر آ جاتا ہے کہ اب وہ رسمی تعلیم کو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں اسکول کے ماحول کو گھر جیسا بنایا جاتا ہے اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ گھر کے آزادانہ اور مانوس ماحول میں بچے کی جو تربیت

ہوسکتی ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہوسکتی۔

۴۔ منصوبی طریقہ (پروجیکٹ میتھڈ) اور ڈالٹن پلان کا استعمال بھی عصری درسگاہوں میں کیا جاتا ہے۔ منصوبی طریقہ میں طلبہ بہت دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ وہ خود اپنی پسند سے منصوبے کا انتخاب کرتے ہیں، اس میں عملی کام زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لیے فطری ماحول پیدا کیا جاتا ہے۔ مثلاً بیماریوں کی روک تھام کے لیے نالیاں صاف کرنا یا معذوروں کی مدد کرنے کے لیے کیمپ لگانا وغیرہ۔ ڈالٹن پلان اس سے مختلف ہے۔ اس میں اساتذہ کو سال بھر کا کام مضمون وار اس انداز سے ترتیب دینا پڑتا ہے کہ ہر مضمون کا پھیلاؤ اور اس ضمن میں انہیں کیا کرنا ہے طلبہ کو اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سال بھر کے کام کو ایک ایک ماہ کی میقات میں تقسیم کردیا جاتا ہے، عمومی قاعدے بتا کر طلبہ سے مقررہ مدت میں کام کی تکمیل کا معاہدہ لیا جاتا ہے دوران میقات کام میں زحمتوں اور مشکلات کو دور کرنے میں اجتماعی وانفرادی امداد دی جاتی ہے۔ اس سے طلبہ میں احساس ذمہ داری اور کام کو مکمل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف طلبہ پوری طرح استاد پر منحصر نہیں رہتے، ان میں خود سے کتابوں، چارٹوں، پوسٹروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اسی کی بنیاد پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سیمسٹر (SEMESTER SYSTEM) نظام قائم ہوا۔ عصری درسگاہوں میں اس کے علاوہ بھی کئی اور طریقوں کو اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً بات چیت کا طریقہ، سوال وجواب کا طریقہ، اخباری یا اطلاعی طریقہ (اسے بیانیہ طریقے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) اور لکچر یا خطابت کا طریقہ وغیرہ۔ اب سمعی و بصری آلات کا استعمال بھی شروع ہوگیا ہے۔ اس جدید ٹکنالوجی کو صرف تعلیم کے

عمل کو دلچسپ بنانے اور اس میں طلبہ کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہی استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے تعلیم کو زیادہ مفید اور بارآور بنانے کے ساتھ جو مقاصد پیش نظر ہیں انکا حصول بھی آسان ہوتا ہے۔

عصری اور دینی مدارس کا طریقہ تدریس

عصری درسگاہوں میں تدریس کے جو طریقے رائج ہیں ان کا ایک مجمل تعارف اوپر پیش کیا جا چکا ہے، البتہ دینی مدارس اور عصری درسگاہوں کے طریقہ تدریس میں کیا فرق ہے اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے میرے ناقص مطالعہ اور مشاہدے میں جو باتیں آئی ہیں انکی بنیاد پر میرا یہ احساس ہے کہ دینی مدارس میں استخراجی اور بیانیہ طریقہ کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں غالباً اہل مدارس کی دو مجبوریاں ہیں۔ اول یہ کہ ان کے نصاب میں موضوعات (CONTENT) کی جگہ کتابیں ہیں، اس لیے استاد کا پورا زور کتابوں کی عبارت کو حل کرنے اور ان کی تشریح کرنے پر صرف ہوتا ہے، اگر موضوعات طے ہوتے تو استاد کے لیے یہ آسان ہوتا کہ وہ اس موضوع سے متعلق مختلف کتابوں سے استفادہ کر کے لکچر دے دیتا، جیساکہ قرون اولی کے اساتذہ کے یہاں 'املا' کا طریقہ رائج تھا۔ جس معنی میں آج لکچر لفظ کا استعمال ہوتا ہے اسی معنی میں "املا" لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ اسی لیے قدیم زمانے کے طلبہ کو بحث ومباحثہ کرنے اور اساتذہ کے ساتھ سوال وجواب کرنے کا پورا موقع حاصل تھا۔ پھر کتابوں کو مقرر کرنے میں اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا ہے کہ جس عمر اور جس سطح کے طلبہ کو جتنے وقت میں یہ کتابیں پڑھائی جارہی ہیں اس اعتبار سے ان کی تعداد زیادہ ہے۔ شاید اسی لیے اساتذہ پورے سال ان کتابوں کو ختم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

دوسری مجبوری یہ ہے کہ استاد نے جو کچھ پڑھا ہے اور جس انداز سے پڑھا ہے اسی طریقے سے اپنی سوچ، اپنے تجربے اور اپنے مشاہدے کی بنیاد پر حاصل کیے ہوئے علم کو کم سے کم وقت میں طلبہ تک پہنچا دینا چاہتا ہے، اس لیے اس کا انداز روایتی ہوتا ہے۔ مدارس میں کئی استاد ایسے بھی ہوتے ہیں جو فی الواقع استاد بننا ہی نہیں چاہتے تھے اور ان کے اندر معلم کے اوصاف بھی موجود نہیں ہیں، لیکن حالات کی مجبوری اور کوئی دوسرا کام نہ ملنے کی وجہ سے انھوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ ایسے اساتذہ سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کرنا کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہوگی وہ نہ تو تعلیم میں طلبہ سے دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی تدریس کے نئے نئے طریقوں کو اختیار کر کے طلبہ میں علم کو منتقل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

وہ جدید طریقے جو دینی تعلیم کے لیے اختیار کیے جا سکتے ہیں

دینی تعلیم کے مختلف موضوعات کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں اور عقائد اور فقہ کے لیے استقرائی طریقہ اپنایا جا سکتا ہے یعنی مختلف مثالیں طلبہ کے سامنے اس ترتیب سے رکھی جائیں کہ عقائد اور فقہ کے اصول طلبہ از خود مرتب کر سکیں۔ فقہ کے لیے منصوبی طریقہ بھی مفید ہو سکتا ہے کہ استاد کچھ ایسے مسائل طلبہ کے سامنے رکھے، جن کے بارے میں طلبہ واقف نہ ہوں، وہ ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے مطالعہ، مشاہدہ اور تحقیق کے بعد کچھ نتائج اخذ کر کے استاد کے سامنے پیش کریں، پھر استاد ان کی مناسب رہنمائی کر کے حقیقت تک پہنچنے میں مدد کر سکتا ہے، حدیث کے لیے سوال و جواب اور بات چیت کا طریقہ بھی مناسب ہو سکتا ہے، حضورؐ اسی اسلوب میں اپنی حکیمانہ تعلیمات کو پیش فرمایا کرتے تھے کہ سامع اور مخاطب پورے ذوق و شوق اور رغبت کے

ساتھ اپنے کان اور دل کو آپؐ کی آواز کی طرف لگا دیتے تھے۔ کبھی آپؐ سوال فرماتے کیا پتہ ہے تمہیں کہ مفلس کون ہے؟ کیا سب سے بڑے بخیل سے تم واقف ہو؟ کبھی آپؐ فرماتے ہلاک ہو گیا' تباہ ہو گیا، صحابہ کرام سوال پر مجبور ہو جاتے کہ کون برباد ہوا؟ کس پر تباہی آئی؟ تب آپؐ ان کے سوال اور اشتیاق کے بعد اپنی بات کی تکمیل فرماتے جو مبلغ اور داعی روانہ کیے جاتے انکو تاکید کی جاتی کہ دیکھو آسان باتیں سکھاؤ مشکلات میں نہ ڈالو، قریب کرنے والی تعلیم دو، دور لے جانے والی تعلیم سے احتراز کرو وغیرہ قرآن کی بہت سی آیتوں کا اسلوب بھی ایسا ہے کہ ذہن متکلم کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس سے بھی تدریسی طریقہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

صرف و نحو، زبان، ریاضی اور بلاغت وغیرہ کے لیے استخراجی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن تفسیر، اصول تفسیر، فلسفہ اور تاریخ کے لیے لکچر کا طریقہ ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے استاد زیادہ مفید باتیں کم وقت میں بتا سکتا ہے اور طلبہ کی دلچسپی بھی قائم رہ سکتی ہے، تحقیقاتی اور بیانیہ طریقے کو بھی ضرورت کے مطابق مختلف جگہ اپنایا جا سکتا ہے۔ البتہ ڈالٹن پلان کی مدد سے مدارس کے تدریسی نظام میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ کنڈر گارٹن اور مانٹیسری طریقوں کی ضرورت غالباً اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں نہیں ہے، البتہ کچھ مخصوص مضامین کے لیے مخصوص جماعتوں میں سمعی و بصری آلات کو بھی استعمال کرنا مفید ہوگا۔

سلف صالح اور ائمہ دین نے درس و تدریس کو مفید اور موثر بنانے کے طریقے خود بھی اختیار کیے اور اپنے متبعین کو بھی ایسے رہنما اصول عطا کیے۔ بعض بزرگان دین کے حالات پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ متعلم میں اکتاہٹ اور کسل مندی طاری

نہ ہونے دیتے تھے اور سبق بوجھل یا بے جان نہ بن جائے اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بعض حضرات استاد بننے کی خواہش میں ان بزرگوں کی مجلس میں سالہا سال گزار کر پڑھانے اور تربیت کرنے کا ڈھنگ سیکھتے تھے۔ اس لیے تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض اساتذہ کے حلقۂ درس میں ہزاروں طالب علم بے اختیار کھنچے چلے آتے تھے۔

درس وفا اگر بود زمزمۂ محبتے　　　جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

معلمین کی تربیت کی ضرورت کیوں

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان مدارس میں جو طلبہ آتے ہیں وہ سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ماحول بھی الگ ہوتا ہے، ان کی صلاحیت اور ذہانت میں بھی فرق پایا جاتا ہے، ان کا فکر و خیال اور یہاں آنے کا مقصد بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سیکھنے کا ان کا ذوق بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ کچھ ایک ہی بات کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں اور کچھ بہت سست رفتاری سے سیکھتے ہیں۔ اتنے متعدد افکار و اذہان اور مختلف اطوار و مزاج کے طلبہ کی تعلیم ایک ہی ڈھنگ اور ایک ہی طریقے سے کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ استاد کو پڑھاتے وقت پیچھے رہ جانے والوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا اور بہت تیز آگے چلنے والوں کی دلچسپی بھی بنائے رکھنی ہوگی۔ استاد کی کامیابی اس میں نہیں ہے کہ وہ کتاب کی مشکل عبارت کو حل کرا دے بلکہ اصل کامیابی تو طالب علموں کی سیکھنے کی مشکلات کا حل کرنا ہے۔

دینی مدارس میں بھی استاد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں استاد کی ذمہ داری صرف درس دینا نہیں ہے بلکہ تربیت کرنا بھی ہے۔ اس لیے استاد کی شخصیت، اس کے اخلاق، کردار، عادات و اطوار، معاملات اور اندازِ گفتگو تک کا طلبہ پر اثر پڑتا ہے، یہی وہ چیز ہے جو اسلامی نظام تعلیم کو دوسرے نظام

ہائے تعلیم سے الگ کرتی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں استاد کو مربی کا مقام دیا گیا ہے اس کی صحبت میں طلبہ علم کو عمل میں لانا سیکھتے ہیں۔ اس طرح طلبہ کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور ذہن و فکر، دل و دماغ اور جسم نشوونما پاتا ہے۔ استاد کے اعلیٰ مقام کو کسی شاعر نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

شیخ مکتب ہے ایک عمارت گر　　　جس کی صنعت ہے روح انسانی

استاد کی عظمت کا اندازہ اس حدیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں محسنِ انسانیت حضرت محمدؐ نے فخریہ ارشاد فرمایا ہے کہ "اِنَّمَا بُعِثْتُ معلما" بیشک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اب اگر وہ شخص جس پر ایک بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہو وہ اس ذمہ داری کو اٹھانے کا اہل نہ ہو تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کام کا کیا حشر ہوگا جو اس کے سپرد تھا۔ یوں سمجھا جائے کہ اگر استاد کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے حلقۂ درس میں شریک طلبہ کی ذہنی استعداد کیا ہے؟ ان کے سامنے سبق کی مشکلات کیا ہیں؟ وہ جو کچھ سکھانا چاہتا ہے طلبہ اسے سیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اس کا طلبہ کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ وہ انکی تربیت کیسے کر سکتا ہے؟ وہ ان کو کس طرح درس دے کہ ان کی اسمیں دلچسپی پیدا ہو جائے؟ ..... وہ اپنی آواز کو کہاں پست کرے اور کہاں زور سے بولے؟ وہ جن مباحث پر گفتگو کر رہا ہے وہ ان طلبہ کے کس کام آئیں گے؟ اسے اپنے طلبہ سے محبت، شفقت اور خیر خواہی کس حد تک کرنی چاہیے؟ وہ جو کچھ پڑھا رہا ہے، اس کا طلبہ کی عملی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ اس کی گفتگو ان کے معیار سے بلند تو نہیں ہے؟ اس کی باتیں ایسی سطحی اور غلط تو نہیں ہیں کہ طلبہ انہیں استاد کی کم علمی پر محمول کریں؟ وغیرہ یہ اور

اس طرح کے بہت سے سوال ہیں جن پر استاد کو اپنی بہترین کارکردگی کے لیے توجہ دینی ہوتی ہے، اسی لیے آج کے زمانے میں 'استاد کی تربیت' ہر نظام تعلیم کا جزء بن چکی ہے، تدریس کے لیے مختلف معیار کے تربیتی ادارے اور ان کے نصاب موجود ہیں، لیکن ہر استاد کے لیے خواہ وہ ابتدائی جماعتوں کو پڑھائے یا انتہائی جماعتوں کو۔ تربیت ناگزیر ہے۔

تربیت کیسے کی جائے؟ اس بات کو تو اب اہل مدارس تسلیم کرتے ہیں کہ مدارس کے معلمین کے لیے تربیت ضروری ہے لیکن ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مدارس کے معلمین کی تربیت کیسے کی جائے؟ اور کون ان کی تربیت کرے؟ تربیت کا خاکہ کیا ہو؟ اور اس کے لیے وسائل کی فراہمی کس طرح ہوگی؟ وغیرہ۔ اس ضمن میں دو باتوں پر اگر اتفاق ہو جائے تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ یہ تربیتی نظام بین المدارس ہو یعنی کسی مدرسہ میں یہ پروگرام ایک ماہ یا اس سے زیادہ ضرورت کے مطابق چلایا جائے۔ اس میں اس مدرسہ کے کچھ یا سب اساتذہ کے علاوہ قرب وجوار کے مدارس کے اساتذہ تشریف لائیں۔ یہ اپنی سہولت کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مدرسہ کتنے اساتذہ کو ایک کیمپ میں بھیجے۔ اسکی دوسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، سبیل الرشاد بنگلور، سبیل السلام حیدرآباد اور اسی طرح کے دوسرے صوبوں میں کسی ایک یا دو مدارس کو تربیت معلمین کا مرکز بنا دیا جائے اور ان میں وقتاً فوقتاً کیمپ لگائے جائیں۔ ان کیمپوں میں ملک کے منتخب دینی مدارس کے بزرگ اساتذہ کو جن کی نظر اپنے مضمون پر بہت گہری ہو اور وہ فن تعلیم و تربیت سے بھی واقف ہوں انہیں تربیت کرنے کے لیے دعوت

دی جائے اور کچھ شعبہ تعلیم کے ایسے مخلص مسلمانوں کو بلایا جائے جو مدارس سے ہمدردی بھی رکھتے ہوں اور ان مدارس کے معلمین کو نفسیات تعلیم، تاریخ تعلیم، مقصد تعلیم اور فلسفہ تعلیم سے بھی واقف کرا سکیں اور تدریسی مشق کے وقت ان چیزوں کو عملی طور پر دکھا بھی سکیں تاکہ تربیت کے بعد انہیں پڑھانے میں آسانی ہو۔

ان کیمپوں کے لیے وسائل کی فراہمی کی ذمہ داری یا تو ان مدارس کے سپرد ہو جن کے اساتذہ ان میں تربیت حاصل کر رہے ہیں یا پھر وہ ادارے معاونت کریں جو دینی مدارس کے معلمین کے لیے 'فن تعلیم و تربیت' کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یا پھر مخیر حضرات سے تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات عرض کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تربیت یافتہ معلمین کو مدارس میں تقرر کے وقت ترجیح ملنی چاہیے اور جو حضرات کسی مدرسہ میں پڑھا رہے ہیں اگر وہ تربیت حاصل کرتے ہیں تو ان کی تنخواہ میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہونا چاہیے تاکہ اس طرف اساتذہ کا رجحان ہو سکے۔ اس تھوڑی سی قربانی کے لیے بھی اہل مدارس کو تیار ہونا پڑے گا کہ تربیت کے وقت کی پوری تنخواہ ان کو دی جائے تاکہ اساتذہ کو ان کیمپوں میں شریک ہونے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

تربیت اساتذہ کے لیے نصاب کا خاکہ تربیتی نظام کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ مستقبل کے معلمین میں ان کے نصب العین کا واضح شعور اور اس سے گہری وابستگی پیدا کرے اور ان میں وہ اخلاقی کردار اور مشنری جذبہ پروان چڑھائے جو انہیں اس منصب کے تقاضے صحیح صحیح ادا کرنے کے لیے تیار کرے۔ نیز انکے اندر مربی ہونے کا جذبہ پیدا کرے اور طلبہ کے ساتھ ان کے رشتہ کا احیاء کرے۔ تربیت معلمین کے لیے ترتیب

دیا جانے والا نصاب درج ذیل نکات پر مشتمل ہو سکتا ہے۔

* اسلام میں تعلیم کی اہمیت۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں۔
* اساتذہ کا معیار اور مثالی اساتذہ۔
* تعلیم اور مقاصدِ تعلیم، فلسفہ تعلیم کی اسلامی نقطۂ نظر سے تشریح۔
* تعلیمی نفسیات۔ بچوں کی نفسیات، مختلف سطح کے طلبہ کی ضرورتیں اور نفسیات۔
* تعلیمی تاریخ۔ علوم کی تاریخ۔
* دوسرے ممالک کے اساتذہ کا معیار تدریس اور طریق تدریس، جدید طریقہ ہائے تدریس کا تنقیدی جائزہ۔
* برصغیر میں توسیع علم کے سلسلے میں مسلمان اساتذہ کا کردار۔
* قرآن پڑھانے کا طریقہ۔
* حدیث پڑھانے کا طریقہ۔
* علم الکلام، فلسفہ، صرف ونحو، ہندسہ، ریاضی، بلاغت، زبانیں وغیرہ پڑھانے کا طریقہ۔
* فقہ، اصول فقہ پڑھانے کا مطلوبہ طریقہ۔
* تفسیر اور اصول تفسیر پڑھانے کا طریقہ۔
* سیاست اخلاق اور تدبر کا علم۔
* امت مسلمہ کے مسائل کا شعور وآگہی تاکہ زیر تعلیم وتربیت طلبہ تک اسے منتقل کیا جاسکے۔
* تدریس کو موثر کرنے کے لیے جدید سمعی وبصری آلات کے استعمال سے واقفیت۔

* جدید علوم مثلاً علم سیاست، علم سائنس، علم معاشیات، علم سماجیات، طبیعی وحیاتی علوم اور عمرانیات کے پڑھانے کا طریقہ۔
* خارجی مطالعہ کی اہمیت، ضرورت اور مطالعہ کے لیے کتب کے منتخب کرنے کا طریقہ۔

یہ چند باتیں خاکے کی شکل میں بطور تجویز پیش کی گئی ہیں۔ اس کا فیصلہ کہ ان میں سے کون سی چیزیں مفید ہیں اور تربیتی نصاب میں انھیں جگہ دی جائے اہل مدارس ہی اپنی ضرورت کے تحت کر سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان باتوں کو سامنے رکھ کر کچھ ترمیم واضافہ کے ساتھ کچھ نئے نکات مرتب کیے جائیں۔ راقم کا مقصد اس ضروری مسئلہ کی جانب قوم کو متوجہ کرنا ہے۔

اخبار علمیہ

استنبول ترکی کے میوزیم کے نوادر و عجائب میں خانۂ کعبہ کے قفل اور کنجیوں کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ بھی ہے، مسلمان خلفاء و سلاطین اپنی تخت نشینی اور جشن وغیرہ کے موقعوں پر خانۂ کعبہ کے لیے نئے تالے اور کلیدیں عام طور سے بطور نذرانہ بھیجتے تھے خانۂ کعبہ کی عظمت کے پیش نظر ان تالوں کی ساخت اور سجاوٹ میں جو نفیس کاریگری فنی خوبی اور کمال ہنر دکھایا گیا ہے اس سے شاہانِ وقت کے لطیف مذاق، بلند حوصلوں کے علاوہ بیت اللہ سے جوش عقیدت کا اظہار بھی ہوتا ہے، یہ تقریباً ۵۵ تالے اور کنجیاں ہیں جو مسلمانوں کے شاندار ماضی کے بعض بند دروازوں کو بھی کھولتے ہیں، اب ترکی سے ایک کتاب خاص اسی موضوع پر شایع ہوئی ہے، اس کے دو ابواب ہیں، پہلے باب میں استنبول میں اس ذخیرہ کی فراہمی اور اس موقع پر شاندار تقریبات کی تاریخ ہے، پھر ان تالوں کی شکلوں اور ان کی فنی خوبیوں، ان کی تزئین نقش نگاری اور ان کے صناعوں کا ذکر عہد بہ عہد کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں عباسی، عثمانی اور مملوک خلفاء و سلاطین کے عہد حکومت میں تیار شدہ ان تالوں کا بہ لحاظ سنین ذکر کیا گیا ہے، جن تالوں کے عکس کتاب میں شامل ہیں ان میں ایک سے ۹ تک عباسی خلافت کے، ۱۰ سے ۲۲ مملوکوں کے اور ۲۳ سے ۵۵ تک دولت عثمانیہ کے سلاطین کے زمانہ کے ہیں، یہ کتاب ترکی اور عربی زبانوں

میں شایع ہوئی ہے اور اب اس کا انگریزی ایڈیشن بھی طبع ہو رہا ہے۔

صنعت و حرفت کے میدان میں تلوار سازی کا فن بھی مسلمان اہل ہنر کی جدت طرازیوں کا مظہر رہا ہے، استنبول کے عجائب خانہ میں جو بیش قیمت تلواریں محفوظ ہیں وہ تاریخی اور فنی لحاظ سے بڑی اہم ہیں، ان میں ۱۴۴ تلواروں کی تصویروں اور ان کی تاریخی اہمیت کو چند سال پہلے کتابی شکل میں پیش کیا گیا تھا، یہ کتاب کویت سے شایع ہوئی تھی، اب اس کا ترجمہ ملیشیا کی مالے زبان میں شایع ہوا ہے، یہ کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ان تلواروں کی مصور تاریخ ہے جن کی نسبت جناب حضور اکرمؐ، خلفائے راشدینؓ اور حضرات صحابہ کرامؓ سے ہے، دوسرے حصہ میں اموی، عباسی، ایوبی، مملوک اور عثمانی سلاطین و خلفاء کی تلواروں کا ذکر ہے، ایک اور باب میں تلوار سازی کے ۴۲ ماہرین کے متعلق معلومات درج ہیں، حواشی اور تعلیقات نے اس کتاب کو اور بھی صیقل و مجلی کر دیا ہے، سادہ تصویروں کے علاوہ رنگین تصاویر بھی ہیں۔

مسلمانوں کے دور عروج کی ایک بہت نمایاں خوبی ان کا ذوق تعمیر اور اس میں انکا کمال فن بھی ہے، اسپین سے چین و انڈونیشیا تک ان کے اس ذوق کی جلوہ آرائیاں آج بھی تابندہ و درخشاں ہیں، مستشرقین یورپ نے جہاں مسلمانوں کے علوم و فنون سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے وہاں انہوں نے اس فن کو بھی اپنے مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنایا ہے، حال ہی میں ہم ایسی ہی ایک کتاب سے واقف ہوئے ہیں، جرمنی میں برلن کے اسلامک آرٹ کے میوزیم کے ڈائرکٹر مینائیل مینخ دو دہائیوں سے عہد مملوک کی عمارتوں کو اپنی تحقیق کا مرکز بنائے ہوئے ہیں، اب انہوں نے دو جلدوں میں اپنے مطالعہ و مشاہدہ کا نچوڑ اس طرح پیش کیا ہے کہ پہلی جلد میں مملوک سلاطین کے فن تعمیر کی ابتداء ارتقاء

اور اثر کا جائزہ لیا ہے، انھوں نے قاہرہ کی عمارتوں پر خاص توجہ کی، کیونکہ قاہرہ کے طرز تعمیر کا اثر دور دور تک ہوا، دوسری جلد میں مملوک سلطنت کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے، اس میں مجموعی طور پر ۲۲۷۹ عمارتیں زیر بحث آئی ہیں، ان میں اب بھی قریباً ۵۰۰ عمارتیں باقی ہیں جو ۹ ملکوں کے ۵۰ سے زیادہ شہروں میں موجود ہیں، ان سب کا سنہ وار جائزہ لے کر ان کی تعمیر، ترمیم اور بازیابی کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے، ناقدین اور ماہرین فن کی نظر میں یہ کتاب فن تعمیر کے ادب میں نہایت عمدہ اضافہ ہے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں اور ان کے آثار، مساجد و مدارس اور کتب خانوں کی تباہی و بربادی اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے، اب یہاں کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب پر معلومات افزا کتابیں برابر شایع ہو رہی ہیں، خلافت عثمانیہ کی ان سابق ریاستوں کا نوحہ و ماتم قدرتاً ترکی میں زیادہ ہوا، چنانچہ حال ہی میں وہاں کے مشہور علمی ادارہ (IRCICA) نے دو کتابیں شایع کی ہیں، ایک کتاب بوسنیا کے اسلامی فن تعمیر سے متعلق ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی رواداری نے صدیوں پہلے بوسنیا کے مختلف مذاہب اور قومیتوں کے درمیان جس رنگا رنگ تہذیب کو وجود بخشا تھا اس میں بڑی خوشنما ہم آہنگی تھی اور اس کا سب سے خوبصورت عکس وہاں کے فن تعمیر میں جھلک رہا تھا، مسجدوں، گرجا گھروں، اسکولوں، بازاروں اور رہائشی مکانوں میں اس کا اثر بڑا خوش رنگ تھا، لیکن ۹۴-۱۹۹۲ء کی دو سالہ خانہ جنگی میں سربوں اور کروشیائی عیسائیوں نے اپنے قدیم صلیبی انتقام کا جو نمونہ پیش کیا اور جس طرح انھوں نے تمام انسانی اور اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھا اس نے بوسنیا

کے عافیت کدہ کو آتش کدہ میں بدل ڈالا، یہ کتاب انگریزی زبان میں اپنے موضوع پر شاید سب سے جامع کتاب ہے، اس میں بوسنیا کی تاریخی عمارتوں کے دور تعمیر و تخریب کا مفصل جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ اب ان عمارتوں کی از سر نو تعمیر کس طرح ممکن ہے، دوسری کتاب میں بوسنیا کے باشندوں اور اس کی آبادی کی تاریخ بیان کی گئی ہے، تاریخی اعتبار سے بوسنیا کی آبادی سے مراد بوسنیائی چرچ (بوگوملس) کرسچین آرتھوڈوکس چرچ، کیتھولک اور اسلام کے ماننے والے ہیں، بوسنیا کے سلاوی باشندے بوسنیائی زبان بولتے تھے، انھوں نے قرون وسطیٰ میں اور عثمانی و آسٹریائی ہنگری دور میں خود کو بوسنیائی کہلانا ہی پسند کیا، بوگوملی فرقہ کے لوگ زیادہ تعداد میں اسلام لائے، چونکہ آبادی کا بڑا حصہ انھی لوگوں پر مشتمل تھا، اسلیے روایتی طور پر بوسنیا میں اکثریت مسلمانوں ہی کی رہی، سولھویں صدی میں وہاں بڑی تعداد میں یہودی آباد ہوئے لیکن اختلاف مذاہب کے باوجود یہ سب بوسنیا کی تہذیب میں بڑی خوبی سے رنگ گئے، اس کتاب کے مولف ڈاکٹر آدم ہینرک خود ایک بوسنیائی اہل قلم اور محقق ہیں اور اس وقت حالت مہاجرت میں ترکی میں ہیں، انھوں نے اپنے وطن اور ہم وطنوں کی بربادی کو دیکھا ہے، اس لیے یہ کتاب پر از معلومات ہونے کے علاوہ پر تاثیر بھی ہو گئی ہے۔

ملکوں اور تہذیبوں کے عروج و زوال اور ان کے بننے بگڑنے میں مورخوں اور محققوں کے لیے محنت، جاں کاہی اور دیدہ ریزی کا سامان ہوتا ہے لیکن موجودہ دور میں اطلس سازوں اور نقشہ نویسوں کے لیے اس میں اور بھی نئی نئی دقتیں پیدا ہو گئی ہیں، روئے زمین کے خط و خال میں پہلی جنگ عظیم کے بعد تیزی سے تبدیلیاں

آئی ہیں اوران کا اثر سب سے زیادہ اطلس ونقشہ جات کے ناشرین پر پڑا، اسکی ایک واضح مثال گذشتہ سال دیکھنے میں آئی، جرمنی کے اتحاد نو کی وجہ سے ٹائمز بکس والوں نے اپنے ٹائمز ورلڈ اٹلس میں نئے رنگ بھرے اور نظر ثانی کی ہوئی فہرست کو دوبارہ شایع کیا تو اس کے لیے ان کو ۹۵ ہزار امریکی ڈالر کا مزید صرفہ برداشت کرنا پڑا، اب بلقانی ریاستوں کی کشمکش، ہانگ کانگ پر ۱۹۹۷ء میں چینی اختیار، جنوبی افریقہ کے نام کی ممکنہ تبدیلی اور سوویت یونین کی شکست وریخت کی وجہ سے ان ناشرین کی پریشانیاں بہت بڑھ گئی ہیں، ناموں اور رنگوں کی تبدیلی، نئی سرحدوں کا تعین، ناموں کے تلفظ کا تغیر اور جلد جلد طباعت کے مسائل ان کے سامنے ہیں، کمیونزم کے زوال نے شہروں، بستیوں اور کوہ و دریا کے ناموں کو بدل دیا ہے، سوویت یونین میں اس قسم کے ...۳۰۰ ناموں میں قریباً ۴ فیصد نام کمیونسٹ تحریک کے زیر اثر رکھے گئے تھے، اب وہ سب بدل گئے اس طرح گویا ۱۲ سے ۱۵ ہزار ناموں کی تصحیح ناگزیر ہوگئی ہے۔

بوسنیا کے المیہ پر صلیبی جنون و وحشت کی یاد کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کے جذبۂ جہاد اور اسکی فتوحات کے نقوش بھی تازہ ہوتے ہیں، حال ہی میں یہ خبر آئی ہے کہ اسرائیل کے شمال میں بحیرۂ جلیل یا بحیرہ مردار کے قریب کھدائی کے دوران ایک ایسا چھوٹا قلعہ برآمد ہوا ہے جسکو ...۸ سال پہلے سلطان صلاح الدین ایوبی نے فتح کیا تھا، قلعہ میں کمان و پیکان، نیزوں اور تیشوں اور منجنیق کے گولوں کا بڑا ذخیرہ بھی برآمد ہوا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلعہ میں موجود اور متعلق صلیبیوں سے سخت جنگ کے بعد اس میں سلطان فاتحانہ داخل ہوا تھا، ہتھیاروں کے علاوہ کدال، کلہاڑی جیسے اوزار بھی خاصی تعداد میں ملے ہیں، قلعہ کی دیوار کے پاس تعمیر میں کام آنے والے مسالہ کا ایک ڈھیر بھی ملا ہے۔

استفسار و جواب

اردو میں حوالے کا رواج

جناب محمد ایوب صاحب، بی۔ اے۔ ام
شاد کالونی، اشوکا گارڈن، بھوپال۔

اردو تصنیفات میں حوالے دینے کا طریقہ کب سے رائج ہوا، کیا علامہ شبلی نے اس کی ابتدا کی؟

معارف: ابھی تک اس حیثیت سے اس کا کوئی جائزہ نہیں لیا گیا ہے تاہم یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق و استناد کا جو معیار و اسلوب علامہ شبلیؒ نے قائم کیا وہ ان سے پہلے اردو کی مذہبی و علمی تصنیفات میں عموماً مفقود ہے، ان کے نامور معاصرین کی قابل قدر کتابوں میں بھی حوالوں اور حواشی کا التزام و اہتمام نہیں ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے استاد کے امتیازات و اولیات میں لکھا کہ "تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو معیار یورپ نے قائم کیا... مولانا نے اپنی تصنیفات اور تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا... انہوں نے ہر علم و فن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتبخانے چھانے، دنیا کے کونہ کونہ سے مطبوعات منگوائے، اور ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالے دیئے"

(حیات شبلی ص ۳۲، ۳۶)

مہدی افادی نے علامہ شبلی کے اسی بانکپن کا اظہار اس خوبصورت جملہ میں کیا کہ "علمی تصنیفات و تالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے بانکے شہسوار اور پھریرا

لکھا کہ "سچ یہ ہے کہ شبلی جامعیت اور وسیع النظری نیز مورخانہ تدقیق اور کمال فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مورخ کے پہلو بہ پہلو ہو سکتے ہیں۔" ڈاکٹر سید عبداللہ نے علامہ کے اولیات کے پیش نظر لکھا کہ "وہ مجتہدانہ صلاحیتوں کو لے کر آئے تھے" اور مولوی اسمٰعیل مدراسی ندوی مرحوم نے صراحتاً لکھا کہ "مولانا شبلی نے اپنی تحریر میں ہر بات کا حوالہ دینے اور ماخذ بتانے کا اہتمام کیا، اردو ہی نہیں عربی مصنفین پر بھی اس حیثیت سے وہ اثر انداز ہوئے، جرجی زیدان نے اپنی تاریخ تمدن اسلامی میں شبلی کے خط کو شایع کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔"

سلطان شمس الدین کا لقب

ایضاً۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اپنی تصنیفات میں سلطان شمس الدین التمش کو ایلتتمش لکھا ہے، مگر مجھے تلاش کے باوجود تمش نہیں مل سکا، رہنمائی کی درخواست ہے۔

معارف: سلطان شمس الدین کے لقب کے تلفظ و املا میں بڑا اختلاف ہے۔ التمش اور ایلتمش کے علاوہ اَلتِمَش، اِیلتَتمَش، اَلتَیتمَش کا املا بھی ملتا ہے، بعض قدیم کتب تاریخ مثلاً منتخب التواریخ، تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری اور طبقات ناصری میں التمش ہی موجود ہے، یہی املا الیٹ کی ہسٹری آف انڈیا میں بھی ہے اور اردو کے بعض اہل قلم جیسے منشی ذکاء اللہ اور میرزا حیرت دہلوی نے بھی اسی لفظ کو پسند کیا ہے اس لفظ کی قبولیت کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ترکی زبان میں چاند گرہن کی رات میں پیدا ہونے والے بچہ کو التمش کہا جاتا ہے اور التمش کے معنی ترکی فوج کے ہراول دستہ کے ہیں۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اسی زبان میں چھ کے عدد کو التمش کہا جاتا ہے۔

لیکن چند اور قدیم کتابوں جیسے انتخاب المنتخب، روضات الصفا اور تاریخ مبارک شاہی

میں ایلتمش نقل ہوا ہے اور اس کے معنی سورج گرہن کے بتائے گئے ہیں جبکہ ایلتمش کا املا تاریخ جہاں کشا اور روزر روشن میں نظر آتا ہے، روز روشن کی ایک عبارت میں ہے کہ "روحانی سمرقندی ... ہنگامیکہ سلطان شمس الدین ایلتمش رنتھنبور را فتح کردہ" (ص ۲۵۶) اس کے علاوہ مولانا عصامی صاحب فتوح السلاطین نے جس کا زمانہ سلطان شمس الدین کے تقریباً دو سو سال بعد کا ہے اپنی کتاب کے متفرق اشعار میں ایلتمش یا التتمش کا املا ہی نقل کیا ہے مثلاً:

همان چیره التتمش سرفراز — که بد محرم خاص ایبک هراز

شنیدم که التتمش دیو بند — بگفتا بصفدار فیروزمند

وزاں پس التتمش نام دار — فرستاد یک چتر گوہر نگار

غرض چونکہ خورشید روئے زمین — شہ التتمش آں شمس دنیا و دین

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک شعر میں اس نے التمش بھی نقل کیا ہے:

چو با ایبک التمش این قصه گفت — دل ایبک از عیش چوں گل شگفت

لیکن اس کتاب کی سرخیوں میں صرف ایلتتمش ہی لکھنے کا التزام کیا گیا ہے۔

دور جدید کے مورخین اور اہل قلم جیسے ہو بروڈز، مورلینڈ، ہوتسما، آرنلڈ، ایشوری پرشاد، ایس آر شرما، اے ایل سریواستو کے علاوہ پروفیسر خلیق احمد نظامی محمد عزیز احمد، اے بی ایم حبیب اللہ، سید معین الحق، وغیرہ نے بھی ایلتتمش کے تلفظ کو ترجیح دی ہے، اس کے معنی محافظ سلطنت اور عالمگیر WORLDGRASPER بتائے گئے ہیں یہ تو قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خاندانی لقب تھا یا تخت پر بیٹھنے کے بعد اسے اختیار کیا گیا یا پھر اپنے معنی کے لحاظ سے یہ جزو نام ہوا تھا، البتہ یہ ضرور

کہا جاسکتا ہے کہ سلطان کو ترکی زبان سے لگاؤ تھا، اس نے آم کو اب سے نغزک کر دیا تھا کہ ترکی زبان میں اس لفظ کے معنی اچھے نہیں تھے (فوائد الفواد ص ۲۱۲)۔

جدید مورخین نے صرف معنی کی وجہ سے لفظ ایلتتمش کو ترجیح نہیں دی ہے بلکہ انکی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ منہاج سراج جو سلطان کا ہم عصر تھا اس نے طبقات ناصری میں سلطان کی مدح میں ایک شعر میں اسے التتمش یا ایلتتمش کے لفظ سے یاد کیا ہے، غلام رسول مہر نے اسے یوں نقل کیا ہے:

آں شہنشاہی کہ حاتم بذل و رستم کوشش است ناصر دنیا و دیں محمود بن التتمش است

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس شعر کے نقل میں بھی اختلاف ہے مثلاً طبقات ناصری کے مصحح ولیم ناسو لیس نے دوسرے مصرع میں التتمش ہی نقل کیا ہے:

ناصر دنیا و دیں محمد بن التتمش است ص ۲۰۲

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہ مصرع اس طرح لکھا کہ:

ناصر الدنیا و دین محمد بن ایلتتمش است

اور محمد عزیز احمد کا نقل کردہ مصرع یوں ہے: ناصر الدنیا و دین محمود بن التتمش است

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ قواعد عروض کے لحاظ سے یہاں صرف التتمش ہی ہو سکتا ہے، اختلاف کتابت نے اس گواہی کو کمزور بنا دیا تھا، لیکن منہاج سراج کے ایک اور شعر میں التتمش کے لفظ کی موجودگی نے اس ضعف کو دور کر دیا، شعر یہ ہے:

اگر سلطانی ہند است ارث دودہ شمسی بحمد اللہ ز فرزنداں توئی التتمش ثانی

(ارلی ٹرکش ایمپائر آف دہلی، عزیز احمد ص ۱۵۶)

لیکن ایلتتمش یا التتمش کے قائلین کے پاس ان شہادتوں کے علاوہ ایک اور

مضبوط دلیل یہ بھی ہے کہ کتبات و سکہ جات میں بھی ایلتتمش کندہ ہے، قطب مینار کی دوسری اور تیسری منزل اور صدر دروازہ پر لفظ ایلتتمش لکھا ہوا لکھا گیا (لسٹ آف محمڈن اینڈ ہندو مونومنٹس کلکتہ ج ۳ ص ۵) آثار الصنادید میں سر سید احمد خاں نے قطب مینار کی چوتھی منزل کی ایک عبارت نقل کی ہے اور اس میں بھی ایلتتمش موجود ہے ان کتبوں کے علاوہ عزیز احمد نے ایچ این رائٹ کی کتاب (THE SULTANS OF - DELHI THEIR COINS AND METROLOGY - کے حوالے سے لکھا ہے کہ سکہ ۱۲۱ کے ایک رخ پر ناگری میں صریحاً دو "ت" موجود ہیں "THE TWO 'TS' ARE GIVEN CLEARLY IN THE NAGRI TRANSLITERATI- -ON ON THE REVERSE OF COIN NO 121"

غلام رسول مہر مترجم طبقات ناصری نے اس اختلاف کی توجیہ کو مشکل قرار دیتے ہوئے لکھا کہ یا تو ان سکوں اور کتبوں کی تحریر کو نادانستہ غلطی سمجھا جائے یا پھر یہ کہا جائے کہ التتمش کے بجائے التمش محض سہولت کی وجہ سے زبان زد ہو گیا یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ خود سلطان کی زندگی میں یہ لقب ان متعدد شکلوں میں بولا جاتا تھا، لیکن مولانا مہر کے ان خیالات کی تائید میں کوئی مضبوط دلیل نہیں اسلیے جدید مورخین نے بجا طور پر معاصر شہادتوں کی موجودگی میں ایلتتمش کے لفظ کو زیادہ راجح قرار دیا، ایشوری پرشاد لکھتے ہیں کہ اب عام طور سے یہی لفظ ایلتتمش رائج و مقبول ہے (ہسٹری آف میڈیول انڈیا ص ۱۶۸)

ع۔ ص۔

آثار علمیہ وادبیہ

مکتوب مولانا عبدالسلام ندوی[1]

بنام

مولوی عبدالباری صاحب[2]

مجبی السلام علیکم

اعظم گڈھ کی خوشگوار ہوا کے جھونکے مبارک، یہاں اگر اعظم گڈھ کی لو کی لپٹ بھی آجائے تو اس کو بوی پیراہن یوسف سے بھی عزیز تر سمجھیں۔

الا انعم صباحا ایھا الطلل امبالی

یہاں الندوہ کی مکمل جلدیں تھیں اور جو ہیں ان میں مضمون مطلوب نہیں ملا آپ رسالہ اردو کی پرانی جلدوں سے وہ رسالہ الگ کر لیجئے، جن میں مولانا شبلیؒ کی شعر العجم پر تنقید نکلی ہے، نیز حسن البیان بجواب سیرۃ النعمان بھی تاکہ مجھکو جب ان کتابوں کی ضرورت ہو فوراً منگوالوں۔

اعظم گڈھ کے دلچسپ حالات سے مطلع فرماتے رہیے، غالباً اعظم گڈھ نے مجھ کو فراموش کردیا ہوگا، لیکن میں بذات خود اعظم گڈھ کی یاد میں خود فراموش رہتا ہوں۔

والسلام

عبدالسلام ندوی

علی گڑھ ۴ر جون ۱۹۳۶ء

---

[1] مصنف اسوۂ صحابہ و شعر الہند [2] دار المصنفین کے ایک قدیم کارکن جو اہل قلم بھی تھے۔

مطبوعات جدیدہ

ڈاکٹر مشیر الحق شخصیت اور فکری بصیرت

مرتب جناب شاہ عبدالسلام، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور بہترین کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۱۲، قیمت ۱۳۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

پروفیسر مشیر الحق بحری آبادی، سرینگر یونیورسٹی کشمیر کے وائس چانسلر تھے کہ وہ کشمیر کے سلسلہ کشت و خون کا ایک حصہ بن گئے، چار سال گزرنے کے بعد اب بھی انکی یادوں کے زخم تازہ ہیں، اس عرصہ میں ان کی یاد میں برابر تحریریں شایع ہوتی رہی ہیں، ان کا ذکر علما اور دانشوروں میں ہوتا رہا، اس کا سبب یہ تھا کہ وہ قدیم روایات وجدید نظریات دونوں سے واقف تھے، مگر بعض مسائل میں ان کے خیالات ایک طبقہ کی نظر میں زیادہ پسندیدہ اور قابل قبول نہیں تھے، اب ان کے عزیز قریب اور لائق مرتب نے اس کتاب میں مختلف اہل علم و قلم کی ایسی تحریروں کو جمع کردیا ہے جن سے صاحب تذکرہ کی شخصیت اور خیالات کی قدر و قیمت ظاہر ہوتی ہے، مضامین خاصی تعداد میں ہیں اور اسی لیے ان میں تنوع بھی نمایاں ہے، ایک مضمون میں پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ کے نام پر رحمۃ اللہ کی علامت ہے، اسی مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ پروفیسر مرحوم کی دعوت پر مختلف مکاتب فکر کے لوگ جمع ہوجاتے تھے، مضمون نگار نے اس خوبی کو "ان کی فراست کا کمال" بتایا ہے، ایک اور مضمون نگار نے انکساری، رواداری، خوش مزاجی کی صفات میں "ذہنی توازن" کا ذکر کرکے لکھا کہ یہ خوبیاں انکے احباب کے درمیان ضرب المثل تھیں۔

اسلامی کارکنوں کیلئے تربیتی گائیڈ از ڈاکٹر ہشام الطالب،

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۱۹ قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، دیچ بلڈنگ، نظام الدین نئی دہلی ۱۳۔

اس کتاب کے مولف عراقی نژاد ہیں اور امریکہ میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد وہ تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ دعوتی اور تبلیغی کاموں میں بھی پیش پیش ہیں، اپنے تجربہ کی روشنی میں انھوں نے تبلیغ کے سلسلہ میں بعض اصولوں اور ضابطوں اور منصوبہ سازی کی اہمیت محسوس کی اور اس کے لیے بعض مفید طریقے ڈھونڈے، ان کے یہ اصول یورپ میں خاص طور پر زیادہ کارگر ثابت ہوسکتے ہیں، اس مفید کتاب کا ترجمہ سلیس اور عام فہم ہونا چاہیے تھا، افسوس ہے اسکا خیال نہیں رکھا گیا، قدم قدم پر ترجمہ پن کا احساس ہوتا ہے، جیسے یہ جملہ کہ "انکے لیے یہ بات قابل فہم ہے کہ اس کام کیلئے وقت درکار ہے جو جامعیت کے ذہنی یقین کو حقیقی زندگی میں اس کی تعلیمات کے بتدریج نفاذ کے ساتھ خلط ملط کردیتے ہیں"۔ اکثر جملوں کا مفہوم واضح نہیں ہو پایا ہے جیسے "ایک کامیاب رہنما میں بچکانہ پن ہوتا اور اس کا طور طریق ایک ذمہ دار اور بالغ انسان جیسا ہوتا ہے، وہ نفسیاتی طور پر کفیل ہوتا ہے اور اپنے پیروؤں کو نفسیاتی محافظت کا نمونہ پیش کرتا ہے"۔ تعبیرات میں بھی یہی حال ہے جیسے رسول اللہؐ کی افتاد مزاجی، انتظامی ہیئت، بہتری تحریر، نصیحت طبع، بلاوابستگی، متفرقہ دلچسپیوں والا، تذکیر و تانیث کا فرق بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا جیسے ایک پریڈ گزر رہا تھا، آج کل کی اہل مغرب وغیرہ، اس قسم کی کتابوں کا عام فہم ہونا ضروری ہے، ناشرین کو اس کا احساس ہونا چاہیے اور اچھے اہل قلم سے ترجمہ کراکے ہی کتابیں شائع کرنا چاہیے۔

ع۔ ص۔